



# دائرة المعارف

یعنی

معارف اعظم کدھ

کی

ستائیسویں جلد

از

جنوری ۱۹۳۱ء تا جون ۱۹۳۱ء

مرتبہ

سید سلیمان ندوی

مطبعہ دارالافتاء  
معارف اعظم کدھ



# فہرست مضمون نگاران معارف

جلد سبب ہفتم جنوری ۱۹۳۱ء تا جون ۱۹۳۱ء  
(بہ ترتیب حروف تہجی)

صفحہ	اسماء گرامی	صفحہ	اسماء گرامی
۱۵۸۸۵۸۲۶ ۲۹۳۲۲۱۶۲ ۳۲۲	۸ مولانا سید سلیمان ندوی،	۹۵	۱ جناب بن منظر حبیب تہر فاروقی حیدر آباد
۳۸۸۱۳۱۳۰۳ ۳۵۳	۹ مولانا عبد السلام ندوی	۱۸	۲ مولوی ابو القاسم حبیب سہروردی حیدر آباد
۴۵۱۲۴۲۲۵۱۲	۱۰ مولوی عبد القدوس ہاشمی ندوی	۳۷	۳ جناب احمد حبیب قادری سہریاں
۱۸۰	۱۱ مولوی عبد القوی صاحب فانی	۱۹۲	۴ مولوی اقبال احمد حبیب سیل ایم اے ال
	ایم اے، پروفیسر کھنولہ یونیورسٹی		ال بی، ایڈووکیٹ اعظم گڑھ،
۱۶۳ ۱۲۲ ۱۲۲ ۱۲۲	۱۲ مولوی محمد عبد اللہ چغتائی لکچرار اسلام آباد	۱۶۳ ۱۶۳ ۱۶۳ ۱۶۳	۵ جناب نواب صدیق جنگ مولانا
	کالج لاہور،		حبیب الرحمن خان شروانی،
۵۸۵۵۱۵۴۱۵۱ ۲۲۰۲۱۵۱۳ ۳۰۰۲۲۲۲۲ ۳۸۰	۱۳ جناب محمد عزیز صاحب ایم اے	۳۵۷	۶ سید یاسر علی ندوی رفیق دار المصنفین
	ال، ال، بی علیگ رفیق دار المصنفین		ڈاکٹر زبیر احمد پی ایچ ڈی، الہ آباد
			یونیورسٹی،



صفحہ	اسماء گرامی	صفحہ	اسماء گرامی
۱۲	جناب شیخ غایت اللہ صاحب ایم	۲۵۴	بنی اے ملتان
۱۳	اسکول آف اسٹڈیز لندن	۲	پیش: جناب شیخ عبد اللطیف جہانم
۱۵	مولانا محمد علی مرحوم	۲۷۶-۲۷۷	گورنمنٹ کالج پسرور
۱۶	مولوی شاہ معین الدین احمد ندوی	۳۷۶-۳۹۶	سپیکل بر مولوی اقبال احمد صاحب ایم
۱۷	رفیق دارالمصنفین	۴۰۸	ال ایل بی ایڈوکیٹ اعظم گڑھ
۱۸	پروفیسر سید نجیب الرحمن صاحب ایم	۳۱۴	شاد: حضرت شاد عظیم آبادی مرحوم
۱۹	اسماعیل کالج ممبئی	۵	شرق: جناب شاہ ابوالشرف صاحب
۲۰	مولوی نصیر الدین صاحب اشقی حیدر آباد	۲۲۸-۱۱۶	مجددی دہلوی ہناجر دینہ
۲۱	جناب قاضی نور الدین صاحب قاضی	۳۱۶	مشہدی: جناب مشہدی
۲۲	بھوج، گجرات	۶۴	صوفی آبادی
۲۳	نخستہ: مولوی سید محمد ابراہیم	۶۴	ندوی
۲۴	سید نوایس صاحب ایم لے پرنسپل بہاولپور	۳۰۷	کالج جوناگڑھ
۲۵	استاد جناب محمد سرخان صاحب	۳۹۷-۴۰۴	
فہرست مضامین			
بلد سبست و مفت مخوری سنہ ۱۹۳۱ء تا جون ۱۹۳۱ء			
صفحہ	عنوان مضامین	صفحہ	عنوان مضامین
۱۲	شذرات	۱۲۰۴-۱۳۲۲-۱۲۲۲-۱۶۲۲-۱۸۲۲-۱۰	

صفحہ	عنوان مضامین	صفحہ	عنوان مضامین
۱۴	مقالہ	۱۴	التاسخ والمنسوخ فی القرآن
۱۵	حضرت ابوہریرہؓ پر گستاخانہ جرح	۲۷۶-۲۷۷	تخصیص تصدیق
۱۶	اٹھارہویں انیسویں صدی کے چند ہندو مصورین	۲۷۶	اسماء الرجال کا قدیم ذخیرہ
۱۷	آہ ارملند!	۲۵۴	کافیال
۱۸	ترکی کے چشم دید حالات	۳۵۷	آئینہ کا عالمگیر مذہب
۱۹	چین میں اشاعت اسلام	۴۲۲	ایرانی فنون کی نمائش
۲۰	مولانا حمید الدین	۵۸۵-۱۷	برطانوی یونیورسٹی میں ہندوستانی
۲۱	خاقانی اور خاقانی	۱۷۰	تہذیب و تمدن
۲۲	خاور نامہ دکنی	۲۰۸-۱۱۶	روس اور یگور
۲۳	خیابان دانش	۲۰۹-۱۱۰۹	سلطان صلاح الدین
۲۴	رفیع الدین شیرازی	۱۸	سنہ ۱۹۳۱ء میں سائنس کی ترقی
۲۵	روضہ تاج محل کی تعمیر	۲۶	سید علی حسینی ہندوستان میں
۲۶	زبان اردو کی اولین تصنیف اور اسکا مصنف	۹۵	فارسی میں زرنے
۲۷	قاری عبد الرحمن محدث پانی پتی	۱۹۴	قدیم اردو بول چال
۲۸	قدیم امریکہ کا معبد	۲۶۶	کیا تخلیق حیات ممکن ہو؟
۲۹	انجینیئر تحقیق	۳۷	ہندوستان کی تعلیمی حالت پر ایک نظر
۳۰	ماسعودی بنوی	۳۷۳	ہندوستان میں اسلام پر عیسائی نقطہ نگاہ



صفحہ نمبر	عنوان مضامین	صفحہ نمبر	عنوان مضامین	صفحہ نمبر
۳۹۶	ملت بے نام	۳۰۰	ہندوستان میں علمی تحقیقات	۱۵
۲۲۷	یادگار شاہ	۳۰۱-۳۰۹	اخبار علیہ	
	باب التقریظ والاشفاق	۳۸۸-۳۹۳	احیائیات	
۱۴۵-۱۶۶	اردو کے نئے رسالے اور اخبارات	۳۰۷	آہ سوزان	۱
۳۱۱	تاریخ ادب اردو	۲		
۲۲۸	تاریخ نشر اردو	۱۴۴	سوال بہ اقبال	۲
۲۷۴	جام صہبائی	۲۲		
۲۷۶	سفر حجاز	۶۴	غزل	۳
۳۱۶-۳۱۴	شاہ محمد خوب	۶۵	کلام پیش	۴
۱۵۸-۱۷۸	مطبوعات اخبار	۶۳	کلام شرف	۵
۳۱۸-۳۲۳		۶۴	لئے ہوئے	۶
۴۷۸-۴۹۸		۳۹۲	مرگ حیات آفرین	۷



جلد سبب و ہفتم ماہ شعبان ۱۳۴۹ھ مطابق ماہ جنوری ۱۹۳۱ء عری

## مضامین

۶-۲	سید سلیمان ندوی	شذرات
۱۷-۷	"	مولانا محمد الدین رحمہ اللہ
۲۵-۱۸	جناب سید احمد اللہ صاحب قادری نائب مدیر تاریخ	رفیع الدین شیرازی
۳۶-۳۶	مولوی عبد اللہ صاحب چغتائی پکچر اسلامیک کالج لاہور	روضہ تاج محل کی تعمیر
۵۰-۳۷	مولوی اقبال احمد صاحب سیل ایم اے ال ال بی اعظم گڑھ	"گنجینہ تحقیق"
۵۴-۵۱	"ع ز"	سیدی علی چلی ہندوستان میں
۵۶-۵۳	"	انٹین کا عالمگیر مذہب
۵۸-۵۶	"	سلطان صلاح الدین
۵۸	"	روس اور ٹنگور
۶۲-۵۹	"ر"	اخبار علمیہ
۶۳	جناب شاہ ابوالشرف صاحب مجددی دہلوی مہاجر مدینہ	کلام شرق
۶۴	جناب شہدتی صوفی آبادی	لئے ہوئے
۶۵-۶۴	جناب نجم ندوی	غزل
۶۵	جناب شیخ عبداللطیف صاحب پیش معلم گورنمنٹ کالج	کلام پیش
۷۷-۶۶	"ر"	اردو کے نئے رسالے
۸۰-۷۸	"	مطبوعات جدیدہ



بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

نَسْتَعِظُكَ بِكَرَمِ

محمد علی!

ما تم یہ زمانہ میں بیاتیرے لہو (جو ہر)

مولانا محمد علی نے ہر شعبان ۱۳۴۹ء مطابق ۲۴ جنوری ۱۹۳۱ء کو تیرپن برس کی عمر میں لندن میں وفات پائی  
اس فرسے غائب کے اس مصرع کو اپنے شعر میں ہرگز اپنی مسافرانہ موت کی آپٹینگی کوئی کی تھی،

مارا دیار غیر میں مجھ کو وطن سے دور

افسوس کہ پروردگار جو ۱۹۱۱ء سے ۱۹۳۱ء تک ہندوستان اور دنیا سے اسلام کے ہر قیامت آفرین سناٹوں  
سے اٹھ کر بلند ہوتی رہی ہمیشہ کیلئے خاموش ہو گئی، وہ بیقرار دل جو اسلام اور مسلمانوں کی ہر مصیبت کے وقت بیتاب  
جاتا تھا اور اوروں کو بیتاب کرتا تھا، درینا کہ قیامت تک کیلئے ساکن ہو گیا، وہ اشک آلود نگین جو دین و ملت کے  
میں آنسوؤں کا دیا بن جاتی تھیں حسرتا کہ انکی روانی ہمیشہ کے لیے بند ہو گئی، وہ مترنم لب جو ہر زم میں خوشنوا بلبل بن کر چمکتے  
ان کے ترانے اب ہمارے کان نہ سنیں گے، وہ آتشین زبان جو ہر زم میں تیغ بران بن کر چمکتی تھی انکی تابش اب کسی معرکہ  
میں ہماری آنکھوں کو نظر نہ آئیگی وہ پر جوش سینہ جو ہمارے مصائب کے پہاڑوں کو سیلاب بن کر بہا لے جاتا تھا، اس کا  
تاکلم ہمیشہ کے لیے ختم گیا، وہ پر زور دست و بازو جو شب و روز کی خدمتگذاری اور نبرد آزمائی میں مصروف تھے وہ اب  
ایسے ٹھکے چہرہ اٹھیں گے اور افسوس کہ شکست خوردہ فوج کا وہ آخری سپاہی جو اعدا کے زرخیز زمین تہا لڑ رہا تھا، آخر  
دشمن سے چور ہو کر ایسا گرا کہ چہرہ کھڑا نہ ہو گا، الوداع! محمد علی! الوداع! والسلام! الی یوم القیامہ!

تو ملت کا عزادار تھا جی کہ ساری ملت تیری سزا دار ہو، تو امت محمدیہ کا سوگوار تھا، فرض ہو کہ پوری امت محمدیہ  
تیرا سوگ کرے، تو نے دنیا سے اسلام کا ماتم کیا تھا، سزا دار ہو کہ دنیا سے اسلام تیرا ماتم کرے، ہندوستان کا ماتم دار طرا  
کا سوگوار عراق کیلئے غزوہ، بلقان کیلئے اشکبار شام پر گریبان، انگور پر مرثیہ خوان، حجاز کا سوختہ غم اور بیت المقدس کیلئے  
وقف الم، اسے ہند کے آوارہ گرد مسافر تیرا حق سرزمین اسلام کے چپہ چپہ پر تھا مناسب یہی تھا کہ تیری لے اولین قبلہ اسلام  
کا سینہ بھٹ جائے اور تو اٹھیں سما جائے،

۔۔۔۔۔

وہ مشرق کی زمین میں پیدا ہوا لیکن مغرب کی آب و ہوا میں نشو و نما پائی، مشرق کی مٹی سے اس کا جسم بنا، لیکن مغرب  
کے ہتھیاروں سے اس نے اپنا جسم سجا، اسکا دل مغربی، مگر دل مشرقی تھا، وہ مشرق کی حمایت میں بارہا مغرب کے ہتھیاروں  
سے لڑا، اور اس نے اس کا لوہا مانا، وہ مشرق کا آفتاب تھا، یہ آفتاب بھی اگر مشرق میں طلوع ہو کر مغرب میں ڈوبا، تو دنیا  
کا کوئی نیا واقعہ نہ ہوا، اور اسی لیے جی تھا کہ مشرق و مغرب کا متحدہ مرکز (بیت المقدس) اس کا دفن بنے، اسے مشرق  
و مغرب کے مالک تو اپنی رضا مند یوں کے پھول سے اس کا دامن بھر دے،

۔۔۔۔۔

محمد علی کے کارناموں میں انکی غریبخوانی کوئی بڑا درجہ نہیں رکھتی، لیکن جس طرح انکی آخری پیشنگوئی کی صداقت کو  
دنیا نے دیکھا اور تسلیم کیا کہ وہ آزاد غلام ہندوستان کو واپس نہ آیا، اسی طرح اس کے مرنے پر معلوم ہوا کہ اس نے زندانِ خانہ  
میں بیٹھ کر اپنے جن واردات کو نظم کیا تھا، وہ سرتاسر صداقت تھے، اور پیشگوئیوں کی عجیب و غریب مثالیں اس نے گنا تھا،  
اللہ ہی کے رستہ میں جو موت آئے تو اچھا  
اکسیر بھی ایک دعا میرے لیے ہے  
محمد علی! مبارک کہ یہ تیری پرتاثر دعا، اکسیر بنی، اور تیرے جی میں قبول ہوئی،

۔۔۔۔۔



مولانا محمد علی کا نام جس طرح دنیا میں ہوا مشرق و مغرب میں ہوا اور پورا ہندوستان میں ہوا مصر اور شام میں  
فلسطین اور اس کے بیت المقدس میں ہوا وہ شاید ہی کسی کے لیے ہوا ہو صاحب دل شاعر کی اس پیشگوئی کی  
صدقت سے آج کس کو انکار ہے۔

”ما تم یہ زمانہ میں ہوا میرے لیے ہے“

مولانا شبلی مرحوم کے مجموعہ مضامین کی مسلسل جلدوں کی اشاعت کی جو امید ہم نے ناظرین کو دلائی تھی  
وہ جلد پوری ہوئی ان کے مذہبی مضامین کی پہلی جلد مطبع معارف نے ڈھائی سو صفحوں میں چھاپ کر شائع کی ہے اس  
جلد میں ان کے تمام قرآنی، کلامی، اور فقہی مضامین شامل ہیں، حقوق الذمین بھی اسی میں داخل ہے، ان مضامین  
کی مفصل فہرست لوح پریشانی اور اشاعت کی غرض سے اسکی قیمت کم رکھی گئی ہے، بہتر یہ ہے کہ جو لوگ ان مضامین  
کی مسلسل جلدوں کے طلبگار ہیں وہ اپنا نام ہمارے ہاں فہرست میں درج کرالیں۔

گذشتہ دسمبر میں ہمارے قریب کے شہر بنارس میں دو تعلیمی مجلسوں نے اپنے اجلاس منعقد کئے، مسلم ایجوکیشنل  
کانفرنس ملی گڈہ اور آل ایشیا ایجوکیشنل کانفرنس، انجمن کے سیاسی عہد میں تعلیمی و کچھ کسکو، تاہم خوشی کی بات ہو کہ بنارس  
میں دونوں کانفرنسوں کے اجلاس کامیاب رہے، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے خطبہ خوان صدر تونواب مسعود جنگ  
وہاں چانسلر مسلم یونیورسٹی تھے، مگر اکثر اجلاسوں کے صدر ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب ہی، صدر راول کا خطبہ صدارت گو  
مختصر تھا، لیکن جان تھا، اور لطیف تر یہ ہے کہ جن نازک اور فتنہ انگیز مباحث کو انھوں نے چھیڑا تھا، ان کے لیے طرز  
اداء اور اسلوب بیان نہایت سنجیدہ اور معتدل اختیار کیا تھا، اور بالکل صحیح طریقہ سے انھوں نے اپنے سامنے یورپ  
کا نمونہ نہیں، بلکہ مشرق ہی کی ایک ترقی یافتہ قوم جاپان کا رکھا تھا،

کانفرنس میں معمولی معمولی تجویزوں کے علاوہ بعض مفید اور دلچسپ تقریریں ہوئیں، اور بعض علمی مضامین بھی پڑھے  
گئے، نواب صدربا جگ کا مضمون حرمین پر نہایت دلچسپی سے سنا گیا، مولوی حمید احمد صاحب انصاری سبیل (رحمہ اللہ)  
جامعہ عثمانیہ نے جامعہ عثمانیہ پر عہد مضمون پڑھا، مولوی ریاست علی ندوی رفیق دارالافتاء نے دارالافتاء کی تاریخ اور کار  
پر ایک مفصل مضمون پیش کیا، جناب محمود احمد صاحب عباسی کی تقریر سلطانین ہند کے فرائین اور بادشاہوں کے تختہ  
پر دلچسپ معلومات رکھتی تھی، ڈاکٹر ضیاء الدین، شیخ عبداللہ صاحب اور پروفیسر خدائی خان کی تقریریں مختلف موضوعات  
پر ہوئیں، کانفرنس کے استقبالی صدر بابا فلیل احمد صاحب کے خطبہ میں بنارس میں ہندوؤں کے تعلیمی اداروں پر بہت  
اچھا تبصرہ تھا، میری تقریر کا عنوان عربوں کے بعض جغرافی معلومات تھا،

آل ایشیا ایجوکیشنل کانفرنس بڑی خوبی سے ہوئی، حاضرین اور مہمانوں کی بڑی کثرت تھی، بڑی بڑی  
ہندوستانی ریاستوں کے نمائندے بھی تھے، باہر کے لوگوں میں چین، سیام، جاپان اور فرنیچ انڈیا کے نمائندے  
تھے، تعجب ہو کہ افغانستان اور ایران کے مہمانوں نے اس سے کچھ نہ لی، ہندوستانی صوبوں میں مدراس کی  
اکثریت تھی، بہر حال اہتمام و انتظام علمی و صنعتی نمائشوں، مجمع اور مہمانوں کی کثرت، اور عمدہ مقررین کی تقریر  
کے لحاظ سے یہ کانفرنس کامیاب رہی، اور چونکہ یہ اس کانفرنس کا سب سے پہلا اجلاس تھا، اس لیے کوئی قابل شکایت بھی  
نہیں

ایک خاص نقطہ نظر سے اس آل ایشیا کانفرنس کو دیکھئے تو آپ جس قدر تعجب کریں وہ کم ہی، ہندو وہ قوم ہے  
جس نے اپنی تاریخ کے روز ازل سے لیکر آج تک آریہ ورت کے باہر قدم نہیں رکھا، کسی دوسری قوم سے مل کر  
کام کرنا، اسکی فطرت نہیں، اتحاد اقوام ایشیا کی نظر سے بھی ہوا، اسکی آواز سے ہندو بھائیوں کے کان کبھی آشنا  
نہیں، لیکن با این ہمہ یہ دیکھ کر اپنے وطنی بھائیوں کی ذہنیت کے حسن انقلاب پر کس قدر حیرت ہے کہ انھوں نے  
آل ایشیا ایجوکیشنل کانفرنس کا تخیل کیا، اس کا انتظام کیا، ان کے امرانے اس کے لیے چندے دیے، ان کے



اہل علم و اہل تعلیم نے اس میں اپنا وقت اور قابلیت صرف کی، ان کے نوجوان بہن والیئر بھرتی ہوئے اور کانفرنس کے  
موضوعہ اجلاس کے قدم قدم پر ان کی زندگی کے نشان ملے تھے۔

خدا جانے ہم مسلمان اس نکتہ کو کب سمجھیں گے کہ ہل شی زندگی کی روح ہے، وہ پیدا ہو تو سب کچھ پیدا ہو، جسم میں روح ہو  
تو اس کے ہر عضو میں احساس ہوگا اور نہ بجان جسم کے کسی ایک عضو میں احساس پیدا کرنے کی کوشش ہو پورے جسم میں روح  
پیدا ہوگی تو موت کی روح مذہب یا سیاست ہے، جو قوم ان دونوں سے بھاگیگی وہ فنا ہو کر رہیگی،

-۵۰۰-

ڈاکٹر ایس۔ ایم۔ ستر (ایک ہندو وید تھے جنہوں نے اپنا ویدک مطلب لندن جا کر کھولا تھا) اور کامیاب ہوئے  
تھے بہت سی کمینہ بیمار بچوں کے معرکہ کے علاج کے، ان کے وہاں انگریز شاگرد بھی پیدا ہوئے، منجملہ انکے ایک انگریز  
خاتون مسٹر جاپلین مین مسٹر موصوف نے ویدک علاج کی نسبت انگریزوں کے شکوک دور کئے ہیں اور ویدک طریقہ  
علاج پر ایک کتاب انگریزی میں لکھی ہے جس کا نام ہے (SOME SPECTS OF HINDU MEDICAL TREATMENT) اور لیوڈون  
۱۹۰۸ء میں رسل ستر (لندن) نے چھاپی جو نام کرنے اپنے لڑ بڑی سلیمینٹ مین اسپر ریو لیو کیا ہو گیا اسلامی طب ویدک سے  
بھی زیادہ کمزور اور فرسودہ ہے کہ اس نے عہد میں اسکو پیش کرتے ہوئے مسلمان طبیب چھپکینے اور پرانے پرموت  
نہیں، دل و دماغ میں قوت چاہیے۔

دارالافتاح میں جو مسجد بن رہی تھی بچہ اللہ کہ بیکریار ہو گئی مجلس کے صدر نشین نواب صدر یار جنگ مولانا شروانی بنائے  
سے جو پور ہو کر غلام گھر صرف اس غرض سے تشریف لائے کہ اس مسجد کا افتتاح کریں، افتتاح کی رسم پڑھی کہ ہر جنوری ۱۳۱۰ھ کو  
جمہور کے دن مولانا کی امامت میں اس میں جمعہ کی نماز ادا کی گئی اور بعد نماز مسجدوں کی اصلی آبادی پر ایک نوٹرو غطا فرمایا کہ ہم  
رمضان المبارک سے وہ باقاعدہ کھل گئی اور نماز و جماعت و تراویح قائم ہو گئی، خدا دارالافتاح کے ساکنوں کو توفیق  
دے کہ وہ اسکی ظاہری و باطنی آبادی میں کوشاں رہیں،

## مقالات

### مولینا حمید الدین

ولادت ۱۲۸۰ھ - وفات ۱۳۲۹ھ

فغان کہ گشت یوشندہ سخن خاموش و گر چگونہ قلبی کنم من این لب و گوش  
اس سے پہلے ہندوستان کے جن اکابر علماء کا نام کیا گیا ہے وہ کل وہ تھے، جن کی ولادت  
اور نشو و نما انقلاب زمانہ سے پہلے ہوئی تھی، آج سب سے پہلی دفعہ ہم نے عہد کے سب سے پہلے عالم کی وفات  
کے نام میں مصروف ہیں، ہم ایک ایسے گریجویٹ عالم کا نام کرتے ہیں جو اپنے علم و فضل، زہد و وسع اور  
اخلاق و فضائل میں قدیم تہذیب کا نمونہ تھا، لیکن جو اپنی روشن خیالی، جدید علوم و فنون کی اطلاع و واقفیت  
اور مقتضیات زمانہ کے علم و فہم میں عہد حاضر کی سب سے بہتر مثال تھا، اس سے پہلے ان تمام علماء نے جو  
علم کلام کا اپنے کو بانی کہتے اور سمجھتے ہیں، جو کچھ کہا اور لکھا وہ دوسروں سے سنی سنائی باتیں تھیں، لیکن اس  
جماعت میں یہ پہلی ہستی تھی جس نے فلسفہ حال کے متعلق نیا یا اثباتاً جو کچھ کہا اور لکھا وہ اپنی ذاتی تحقیق اور  
ذاتی علم و مطالعہ سے،

آج ہمارے سامنے ایسے متعدد علماء کی مثالیں ہیں جنہوں نے عربی علوم کی تکمیل کے بعد انگریزی تعلیم  
شروع کی، اور بی اے اور ایم۔ اے اور پی ایچ ڈی کی سندیں حاصل کیں، لیکن اس طرح کہ  
جو پڑھا لکھا تھا یا زنی اسے صاف دل سے بھلا دیا



نئے رنگ نے پرانے رنگ کو اتنا پسپا کر دیا کہ ان پر اس کا نشان بھی نظر نہیں آتا، لیکن آج ہم جس کی  
کا تذکرہ کر رہے ہیں، اس کا یہ حال تھا کہ اس کے نئے رنگ کی شوخی سے اس کے پرانے رنگ کا گہرا سن او  
بڑھ گیا تھا اور اس کو دیکھ کر یہ سمجھنا بھی مشکل تھا کہ یہ علی گڑھ کا کج اور الہ آبادیو رشی کا گریوٹ ہی، بلکہ سچ ہے  
کہ اس کی سادگی کو دیکھ کر عوام بظاہر اس کو عالم بھی مشکل ہی باور کر سکتے تھے، مگر وہ وہ تھی، جو اہل زمانہ  
میں کوئی نہیں،

ولادت | اعظم گڑھ سے دو اسٹیشن پہلے پھر ہیا ایک گاؤں ہے، وہی مولانا کا پدری وطن تھا، اسی پھر ہیا  
کو عربی شکل دیکر مولانا اپنے نام کے ساتھ کبھی کبھی فراہی لکھا کرتے تھے، مولانا شبلی مرحوم اور مولانا حمید الدین  
میرے پھوپھو بھائی تھے، مولانا حمید الدین کے والد مولوی عبدالکریم صاحب مولانا شبلی کے ماموں تھے،  
دونوں بھائیوں کی پیدائش چھ برس آگے پیچھے ہوئی، مولانا شبلی ۱۲۵۵ھ میں پیدا ہوئے، اور مولانا حمید الدین  
صاحب ۱۲۸۸ھ میں، مولانا حمید الدین کے حقیقی چھوٹے بھائی شیخ حاجی رشید الدین صاحب ہیں، جو علی گڑھ  
کالج کے پرانے تعلیم یافتہ ہیں، اور سرسید کے عہد کے طالب العلم ان سے اچھی طرح واقف ہیں،

مولانا کا اصلی نام تو حمید الدین تھا، مگر وہ اس نام کو جو حقیقت عربی قاعدہ سے لقب ہوا، اپنے لئے  
منوی حیثیت سے بلند سمجھتے تھے، اس لئے وہ عربی تصانیف میں اپنا نام عبدالحمید لکھتے تھے، اور تمام بڑے بڑے  
عالمانہ آداب و القاب کو چھوڑ کر صرف معلم کہلانا اپنے کو پسند فرماتے تھے، بنابرین، وہ اپنا نام المعلم عبدالحمید  
الفراہی کتابوں کی لوحوں پر لکھا کرتے تھے،

تعلیم | مولانا نے پہلے حفظ شروع کیا، اور قرآن مجید کے حافظ ہوئے، اور فارسی کی ابتدائی کتابیں اسی  
ضلع کے ایک دیہات چٹارا کے باشندہ مولوی ہمدی حسین صاحب سے پڑھیں، اس زمانہ میں شرفا کی تعلیم  
کا فارسی ادب سب اہم جزو تھا، مولانا کو ادبیات سے فطری لگاؤ تھا، چنانچہ فارسی زبان اور فارسی ادب  
کا ذوق بچپن سے ان میں نمایاں تھا، اس وقت مولانا شبلی مرحوم عربی کی اعلیٰ کتابیں اعظم گڑھ میں مولانا

صاحب چر یا کوئی سے پڑھ رہے تھے، مولانا فاروق صاحب اپنے عہد کے سب سے بڑے عالم ہونے کے ساتھ فارسی  
کے سب سے بڑے ادیب اور استاد تھے، مولانا حمید الدین صاحب کی آمد و رفت یہاں بھی رہا کرتی تھی،  
اور یہ عالمانہ صحبتیں ان کو ملا کرتی تھیں،

ابھی مولانا کی عمر سولہ برس کی تھی، کہ فارسی کے سب سے بڑے گوشتا و خاقانی شروانی کے متبعین میں ایک  
قصیدہ لکھا جس کی ردیت آئینہ اور قافیہ جوہر کفر وغیرہ ہے، سلطان عبدالحمید خان کی مدح میں ہو، مطلع ہی  
بے جلوہ رخ تو بود مضطر آئینہ، خارا نکلند بہ پیرہن از جوہر آئینہ  
بعد کے شعر ہیں،

گیسویے بچو شب تو بیارے دم بصبح فرمے تو بیاد و راز خاور آئینہ  
گستاخ دیدہ است بر فے تو لا جسم چشم سپید یافت بدین کیفر آئینہ  
آئینہ واکذار و بیاد و دیدہ ام، چشم بود آئینہ بہتر ہر آئینہ  
در بزم انس غریب چرا جاے دادہ تاملی شود برابر تو اکثر آئینہ،

کے باضمیر شاہ شود ہمسرا آفتاب

کے روئے چھو ماہ ترا ہمسرا آئینہ

۲۸ شعرون کا قصیدہ تھا، لوگوں کو پڑھ کر بڑی حیرت ہوئی، یہ فارسی، یہ لطف زبان، یہ شیرینی  
اور یہ شکوہ و کھل سب کو تعجب تھا، مولانا شبلی فرماتے تھے، کہ میں نے اس کو لیا کہ مولانا فاروق صاحب کو  
دکھایا، اور پوچھا کہ آپ کے نزدیک یہ کس کا کلام ہے، انھوں نے فرمایا یہ تو نہیں بتا سکتا، مگر قدما میں سے کسی  
کا معلوم ہوتا ہے، مولانا شبلی نے فرمایا یہ حمید کا ہے، حیرت ہو گئی،

مولانا حمید الدین صاحب فطرۃ نہایت ذہین، نہایت طباع اور نہایت قیصر تھے، ان کا ذہن نہایت  
صاف تھا، وہ اول ہی وہلہ میں بے کج و بیچ حقیقت کی منزل مقصود تک پہنچ جاتے تھے، ان کا نظر



سائبر لینے کے بعد کرنل گنج اسکول الہ آباد میں داخل ہو گئے انٹرنس کا امتحان پرائیویٹ طور پر دے کر  
 دل لے، اوکاج علی گڑھ میں داخل ہوئے، یہ علی گڑھ کالج کے اوج شباب کا زمانہ تھا، سر سید اس کے  
 ناظم اعلیٰ، مسٹر آرنلڈ اور بک وغیرہ اس کے پرنسپل اور پروفیسر اور مولانا شبلی اس کے مدرس، مولانا صاحب  
 وہاں کے مقیم و ساکن تھے، ہر وقت علمی مسائل و تحقیقات کے پیچھے رہتے تھے، اور ان بزرگوں کی صحبتیں حاصل  
 تھیں، جنہیں ہر ہونہار طالب العلم کے فطری جوہر کے چمکنے کا موقع حاصل تھا، مسٹر آرنلڈ فلسفہ پڑھاتے تھے  
 مولانا کو فلسفہ جدیدہ کا ذوق انہیں کی تعلیم سے ہوا۔

اس زمانہ میں کالج کے ہر طالب العلم کو عربی و فارسی بھی لازماً پڑھنی پڑتی تھی، مگر سر سید نے ان کے متعلق  
 سربک کو لکھ کر بھیجا کہ حمید الدین عربی و فارسی کے ایسے ہی فاضل ہیں جیسے آپ کے کالج کے استاد اور  
 پروفیسر ہیں، اس لئے انکو مشرقی علوم کے گھنٹوں سے مستثنیٰ کر دیا جائے، چنانچہ وہ مستثنیٰ کئے گئے،  
 مولانا حمید الدین صاحب کی تالیف و تصنیف کا عہد طالب علمی ہی سے شروع ہو گیا تھا، او  
 ذہ بزرگوں نے فرمائش کر کے شروع کرایا، اسی زمانہ میں علی گڑھ کالج کے دینیات کے لئے سر سید نے  
 مولانا شبلی مرحوم سے عربی میں سیرۃ نبوی پر ایک مختصر رسالہ لکھوایا تھا، جس کا نام "تاریخ بدو الاسلام  
 ہے، پھر مولانا حمید الدین صاحب سے اس کا فارسی میں ترجمہ کرایا، استاد و شاگرد کے یہ دونوں عربی  
 و فارسی رسالے اسی وقت چھپ گئے تھے۔

سر سید کو طبقات ابن سعد کا ایک ٹکڑا و فوڈ نبوی کے متعلق کہیں سے ہاتھ آیا تھا، اس وقت  
 تک یہ بھی نہیں تھی، سر سید نے مولانا حمید الدین صاحب سے اسکا فارسی ترجمہ کر کے چھپوایا، اس کی زبان  
 ایسی ہو کہ معلوم ہوتا ہو کہ عہد سامانی کا کوئی شریف فارسی لکھ رہا ہو،

فالباسنہء میں یا اس کے پس و پیش الہ آباد یونیورسٹی سے بی اے کی سند حاصل کی۔

۱۸۹۵ء میں عربی میں ایم اے کا امتحان دینا چاہا تھا، مگر نہیں دے سکے، ۱۸۹۶ء میں مدرستہ الاسلام

مسائل کی تشریح اور مشکلات کے حل میں ہمیشہ نشانہ پر مٹھتا تھا، دماغ اتنا سلجھا تھا کہ کتنا ہی پیچیدہ مسئلہ تو  
 وہ اسکی اصل تک پہنچ جاتے تھے، اور اگر وہ مناظرہ پر اتر آتے تو کسی ہی غلط بات ہو وہ اسکی ایسی عمدہ  
 عمدہ دلیلین پیش کرتے تھے کہ حریف ساکت ہو جاتا تھا، اور سمجھ لیتا تھا کہ یہ مولانا کی اصلی رائے ہو، مگر تھوڑی  
 دیر کے بعد وہ مسکرا کر فرماتے کہ یہ تو غلط تھا، اصلیت یہ ہے،

فارسی کے بعد مولانا نے عربی کی تعلیم شروع کی، اور بھائی (مولانا شبلی) سے عربی پڑھنے لگے، چنانچہ غلط  
 تک مولانا شبلی ہی سے تعلیم پائی، مولانا شبلی جب یہاں سے باہر نکلتے تو یہ بھی گئے، لکھنؤ جا کر مولانا حمید الدین  
 صاحب فرنگی محل میں مولانا عبدالحی صاحب فرنگی محل سے کچھ پڑھا، اس زمانہ میں لکھنؤ میں خواجہ عزیز الدین  
 صاحب عزیز لکھنوی (پروفیسر فارسی کیننگ کالج لکھنؤ و مصنف قیصر نامہ) لکھنؤ میں فارسی کے نہایت مستند  
 استاد اور شاعر تھے، ان کی صحبتوں میں شرکت کا اتفاق ہوتا رہا، اور ان دونوں بھائیوں سے خواجہ صاحب  
 کے اسی فارسی کے رشتہ سے تعلقات محبت، عزیزانہ حیثیت تک پہنچ گئے تھے، لکھنؤ کے بعد مولانا لاہور جا کر  
 مولانا فیض الحسن صاحب ہمارن پوری سے عربی ادب کی کتابیں پڑھیں، اس زمانہ میں یہاں نیا نیا اور شیل  
 کالج کھلا تھا، مولانا فیض الحسن صاحب اپنے عہد کے مشہور ادیب اس میں مدرس تھے، انکا نام منکر دور دور سے  
 طلبہ پڑھنے آتے تھے، لیکن مولانا حمید الدین صاحب نے مولانا فیض الحسن صاحب سے خارج میں پڑھا، اور یہیں  
 ان کی ملاقات مولوی وحید الدین صاحب سلیم پانی پتی سے ہوئی، اور وہ دوستی تک پہنچی، جو آخر تک  
 قائم رہی، اور اسی دوستی کی کشش تھی کہ مولوی وحید الدین صاحب سلیم جامنہ عثمانیہ حیدرآباد تک پہنچے  
 مولانا میں برس کی عمر میں ۱۳۱۳ھ میں عربی تعلیم سے فارغ ہو گئے، اور عربی ادب میں بھی وہ کامل  
 حاصل کیا کہ سچ یہ ہے کہ وہ اس میں اپنے استادوں سے بھی گویا سبقت لے گئے، ان کا عربی و یونانی اس  
 بیان کا شاہد ہے۔

انگریزی تعلیم | اس زمانہ میں انگریزی پڑھنا کفر سمجھا جاتا تھا، مگر یہ کفر مولانا نے توڑا، انج کے طور پر انگریزی



کراچی میں مدرسہ کی کوشش کی، سرسید نے سرٹیفکیٹ دیا، اسی زمانہ میں مسٹر آرمڈ انگریزی میں عربی کی ایک مختصر کتاب ترجمہ کرنا چاہتے تھے، اس کے لئے مولانا اسی کا نام ان کے ذہن میں تھا،

عازمت | بہر حال مولانا کا تعلیمی عہد ختم ہو گیا، سن ۱۸۹۷ء وہ مدرسہ الاسلام کراچی میں مدرس مقرر ہو گئے یہ مسلمانوں کا ایک انگریزی کا بہت پرانا اسکول ہے، اس کی عمارت بہت شاندار اور اساتذہ اعلیٰ ہیں، اور سندھ میں اس کا کافی شہرت حاصل ہے، مولانا اس میں سن ۱۸۹۷ء تک رہے، سن ۱۸۹۷ء میں امیر عبدالرحمان خان والی کابل ایک ترجمہ کا محکمہ قائم کرنا چاہتے تھے، اس میں ابن خلدون کا ترجمہ بھی پیش نظر تھا، اس کے لئے مولانا شبلی نے اس کا انتخاب کیا، مگر کسی وجہ سے یہ تجویز عمل میں نہ آ سکی، اور وہ کراچی میں بدستور رہے، اور درس و تدریس کے علاوہ تصنیف و تالیف کا شغل جاری رکھا، یہیں کے قیام کے زمانہ میں سن ۱۸۹۷ء میں ان کا فارسی دیوان شایع ہوا، اور مولانا شبلی مرحوم کے بار بار کے تقاضے سے جیسا کہ مکاتیب شبلی جلد دوم میں ان کے خطوط سے ظاہر ہے، علمی حبشہ پر نقد و نظر کی طرف توجہ فرمائی، اور خصوصیت کے ساتھ قرآن پاک کے نظم و بلاغت میں انہماک پیدا ہوا، اور تہذیبہ البلاغۃ نام رسالہ لکھا، جب کا خلاصہ مولانا شبلی مرحوم نے خود اپنے قلم سے اردو کے دسمبر ۱۹۰۵ء میں شایع کیا،

اسی زمانہ میں (غالباً سن ۱۸۹۷ء میں) جب اُس وقت کے وائسرائے لارڈ کرزن نے سواہل عرب اور خلیج فارس کا سیاسی بحری سفر کیا تھا، اور سواہل کے عرب شیوخ اور امراء کو اپنی ملاقات کے لئے جمع کیا تھا، تو مولانا اسی کا انتخاب ترجمان کی حیثیت سے ہوا تھا، وہ اس سفر میں لارڈ کرزن کے ساتھ تھے اور عرب سرداروں کے سامنے لارڈ کرزن کی طرف سے جو عربی تقریر پڑھی گئی تھی، وہ انھیں کی لکھی ہوئی تھی، سن ۱۸۹۷ء میں گورنمنٹ نے علی گڑھ کالج کو ایک معتد بہ عظیمہ عربی تعلیم کے لئے دیا تھا، جس کے لئے شرط یہ تھی کہ اس کا پروفیسر کوئی یورپین ہو، چنانچہ جرمن فاضل یوسف ہارویز کا اس کے لئے انتخاب ہوا،

۱۔ مکاتیب شبلی جلد دوم بنام مولانا حمید الدین صاحب، خط نمبر ۱۷۷، ایضاً خط نمبر ۱۷۸،

ساتھ ہی مولانا کا انتخاب مددگار پروفیسر کی حیثیت سے ہوا، اور وہ علی گڑھ چلے آئے، علی گڑھ میں بھی وہ زیادہ دن نہیں رہے، بہر حال جتنے دن بھی رہے، اپنے علمی کاروبار میں مصروف رہے، ہارویز صاحب مولانا سے اپنی عربی کی تکمیل کرتے تھے، اور مولانا ان سے عبرانی سیکھتے تھے، اور ساتھ ہی قرآن پاک کی تفسیر اور تفسیر کے مقدمہ کے اجزاء کی تالیف کا کام جاری تھا،

مولانا شبلی مرحوم کے تعلق کے سبب، پھر خود مولانا حمید الدین صاحب کے ذاتی فضل و کمال کے باعث علی گڑھ کے علمی حلقہ سے ان کے روابط قائم ہو گئے تھے، خصوصاً نواب صدیق خان جنگ مولانا حبیب الرحمن خان شروانی رئیس حبیب گنج کی ذوق آشنا اور قدر شناس نگاہوں سے وہ کہاں بچ سکتے تھے، چنانچہ اکثر آمد و رفت رہتی تھی، نواب صاحب مدوح نے مولانا کی وفات کے بعد جو والا نامہ مجھے لکھا ہے، اس میں رقم فرماتے ہیں،

”مجھ کو مولانا سے دیرینہ نیاز حاصل تھا، ابتدائی ملاقات کا ذریعہ علامہ شبلی مرحوم تھے، علی گڑھ

کی پروفیسری کے زمانہ میں ملا، پھر حیدر آباد میں ..... علی گڑھ کے دور میں بھی تدریس

قرآنی کا شغل جاری تھا روزانہ ۲ بجے شب سے صبح کے نو بجے تک اس میں وقت صرف کرتے تھے،

ملاقات کے وقت نتائج تحقیق بیان فرماتے، اس زمانہ میں دیگر کتب سادی کا مطالعہ اور اس کی

مدد سے مطالب قرآنہ کا حل خاص کر پیش نظر تھا، اسی حالت میں علی گڑھ چھوڑا“

اجزاء جو لکھتے جاتے تھے وہ مولانا شبلی مرحوم کی خدمت میں بھیجتے رہتے تھے، اور مولانا اس کے

متعلق اپنی رائے خطوط میں اور زبانی ظاہر فرماتے تھے، شروع شروع میں استاد کو اپنے شاگرد کے اس

نظریے سے اختلاف تھا کہ قرآن پاک کے مطالب و معانی مرتب و منظم ہیں، اور وہ مولانا حمید الدین صاحب

کی اس کوشش کو رائے گمان سمجھتے تھے، لیکن جب انھوں نے ان کی تفسیر کے متعدد اجزاء دیکھے تو قائل ہو گئے

چلے گئے اور آخر داد دینے لگے، اور حوصلہ افزائی کرنے لگے، اور آخر آخر میں تو وہ مولانا حمید الدین



کی نکتہ دانی کے اس درجہ قائل ہو گئے تھے کہ قرآنی مشکلات کے حل میں وہ ان سے مشورہ لینے لگے۔  
ایک خط میں لکھتے ہیں:-

”تفسیر ابی لب اور بھرہ البلاغہ کے اجزا بغور دیکھے، تفسیر پر مکتوب مبارکباد دینا ہوں، تمام  
مسلمانوں کو تحاریر امنوں ہونا چاہئے، بلاغت کے بعض اجزا احمولی اور سرسری ہیں، اگر مصلو  
کا رد البتہ قابل قدر ہو (جون سنہ ۱۹۰۶ء)

علی گڑھ کے قیام ہی کے زمانہ میں انھوں نے اقسام القرآن لکھی یعنی اس مشکل کا حل فرمایا  
کہ خدا نے قرآن مجید میں قسمن کیوں کھائی ہیں اس سوال کے جواب میں سب سے پہلے امام رازی نے  
تفسیر کبیر میں جہنہ جہنہ فقرے لکھے تھے، پھر ابن قیم نے التبیان فی اقسام القرآن لکھی، مگر مولانا حمید الدین  
صاحب کی تحقیقات نے اپنی الگ شاہراہ نکالی، اور حقیقت یہ ہے کہ اس بارہ میں انھوں نے ایسی داد  
تحقیق دی کہ تیرہ سو برس میں اسلام میں کسی نے نہیں دی، مولانا شبلی مرحوم نے اُن کے اس رسالہ کا خلاصہ  
نہایت مسرت اور خوشی کے ساتھ اندوہ اپریل سنہ ۱۹۰۶ء میں شائع کیا، اور عربی رسالہ اقسام القرآن کے  
کے ہم سے الگ شائع ہوا، اس کے بعد اس سال کو مزید تحقیقات سے مزید کہے اعلان فی اقسام القرآن کے نام سے علی گڑھ میں چھپوایا، اس  
سے لیکر آج تک مختلف زبانیں تحقیق نے اقسام القرآن پر جو کچھ کہا ہے، وہ تمام تر مولانا کے خان علم کی زلہ ربانی ہو

اس کے بعد اگست سنہ ۱۹۰۶ء میں اقسام القرآن کے علاوہ سورہ ابی لب اور سورہ قیامت  
کی تفسیر میں مچھین اور ابی علم نے اُن کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا، علامہ سید رشید رضا صاحب  
الذکر جو خود تفسیر لکھ رہے تھے، انھوں نے ان پر مداحانہ اور مسرت فائدہ تقریظ لکھی، اور تحسین کی  
سنہ ۱۹۰۶ء کو حبیب مولانا حمید الدین صاحب کراچی یا علی گڑھ سے وطن آتے جاتے تو لکھنؤ میں بھائی  
لے یہ تمام حادثات مکتب شبلی کی دوسری جلد میں نذر آئیں گے، لکھ بھی حال میں وہ مصنفین نے مولانا کے اس سالہ کو  
مصر سے خوبصورت کتاب میں چھپوایا ہے، ایک مینہ میں امید ہو کہ ہندوستان پہنچ جائے، شاید مرقیت ہو

کے پاس کچھ دن ٹھہر کر آتے جاتے، اور سنہ ۱۹۰۶ء سے مولانا خاص طور سے تقاضا کر کے بلواتے اور اپنے  
پاس ٹھہراتے، مقصود یہ تھا کہ ندوہ کے طلبہ ان سے فائدہ اٹھائیں، چنانچہ انھیں کے اصرار سے کئی دفعہ  
وہ ندوہ میں آکر رہے اور طلبہ کو کبھی فلسفہ جدیدہ اور کبھی قرآن کے سبق پڑھائے، میں بھی اس زمانہ  
میں ندوہ کا طالب العلم تھا، مولانا کے ان درسوں سے مستفید ہوا،

اس زمانہ میں مولانا ابوالکلام صاحب مولانا شبلی مرحوم کے پاس ندوہ میں مقیم تھے، اور اندوہ  
کے مددگار ڈیڑھ تھے، وہ مولانا حمید الدین صاحب کی ان صحبتوں سے مستفید ہوتے رہے، اور قرآن پاک کے  
درس و نظر کے نئے راستوں کے نشان پانے لگے، اور بالآخر الہامال کے صفحات میں اس جادہ پیمائی کے  
مختلف مناظر سب کی نظروں کے سامنے آئے، اسی زمانہ میں اندوہ العلماء نے ان کو اپنی مجلس امتحان  
کا رکن بنایا، اور آخر زمانہ تک وہ برابر رکن رہے،

مولانا حمید الدین صاحب علی گڑھ میں دو سال کے قریب رہے، اس کے بعد سنہ ۱۹۰۶ء میں الہ آباد  
یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے، کالج کے درس کے علاوہ بقیہ اوقات وہ تالیف و  
تصنیف میں صرت کرتے تھے، ہمیں سے انھوں نے سورہ تحریم کی تفسیر شائع کی، اور غالباً رسی  
میں یعنی عربی الفاظ کی آئینش کے بغیر حضرت سلیمان علیہ السلام کے مواعظ کا عبرانی سے فارسی نظم (نظم  
میں ترجمہ شروع کیا تھا، مولانا کا الہ آباد ہی میں قیام تھا کہ ان کے اہل برادری میں ایک نئے عربی  
مدرسہ کے قیام کی تحریک پیدا ہوئی، مولانا شبلی اور مولانا حمید الدین صاحب مرحوم نے اس تحریک کی  
عنان اپنے ہاتھ میں لی اور سنہ ۱۹۰۶ء عظم گڑھ میں مولانا حمید الدین صاحب کے قریہ پھر اسے ایک اسٹیشن بعد  
سرے میں مقام میں آبادی سے باہر ایک باغ میں اس مدرسہ کی بنیاد رکھی گئی، مولانا شبلی نے  
اس کی نظامت کا بار مولانا حمید الدین صاحب کے کندھے پر رکھنا چاہا، اور اپریل سنہ ۱۹۰۶ء کے ایک مکتوب  
میں وہ لکھتے ہیں:-



”کیا تم چند روز سرائیکر کے مدرسہ میں قیام کر سکتے ہو، میں بھی شاید آؤں“ اور اس کا نظم و نسق درست کر دیا جائے، اسکو گروکل کے طور پر خالص مذہبی مدرسہ بنانا چاہئے یعنی سادہ زندگی اور قناعت اور مذہبی خدمت مطیع زندگی ہو۔

اس مدرسہ نے رفتہ رفتہ ان دونوں بزرگوں کے زیر ہدایت ترقی شروع کی، اور یہ لوگ کبھی کبھی اس کو دیکھتے تھے،

مولانا سید امجد الدین آبادی رہے،

حیدر آباد وکن میں دارالعلوم کے نام سے ایک قدیم عربی مدرسہ تھا، جس نے حیدر آباد کی علمی و تعلیمی ترقی میں کار نمایان انجام دیا تھا، اس کا اسحاق مدرس یونیورسٹی کے شعبہ مشرقیات سے تھا، غالباً ۱۹۱۵ء میں مدرس یونیورسٹی نے اس الحاق کو توڑ دیا اب ریاست کے تعلیمی محکمہ کے ذمہ دار افسردن کو اس قدیم مدرسہ کے جدید انتظامات و تعمیرات کی فکر لاحق ہوئی، اور اس کے لئے نواب عماد الملک مرحوم صاحب ناظم تعلیمات حیدر آباد وکن، اور مسٹر الما لطیفی آئی سی ایس جو اس وقت ناظم تعلیمات تھے، اور مسٹر حیدری وغیرہ نے اہل فن کی مجلس بنائی جس کے ایک ممبر مولانا شبلی مرحوم تھے، مولانا نے اس کے لئے ایک سکیم مرتب کی، اور ایک مشرقی یونیورسٹی کی بنیاد رکھنے کی تجویز پیش کی، یہ تجویز اسی وقت اندو

میں مولانا نے شایع بھی کر دی تھی، مولانا شبلی مرحوم کا اس وقت کا تخیل یہ تھا کہ عربی زبان کی یہ ایک یونیورسٹی ہوگی، جس میں جدید علوم کی بقدر ضرورت آمیزش ہوگی، یہ اسکیم مدت تک زیر بحث رہی، اس اسکیم کے مطابق دارالعلوم کو چلانے کے لئے مولانا حمید الدین صاحب کا انتخاب ہوا، اور وہ اس کے صدر (پرنسپل) بنائے گئے، اور ۱۹۱۷ء کے اوائل میں الہ آباد سے حیدر آباد چلے گئے، حیدر آباد جا کر اس نئی مشرقی یونیورسٹی کے خاکہ بنانے میں مصروف ہوئے، درس و تدریس

لے مکاتیب پبلیشنگ،

کے علاوہ مدرسہ کی انتظامی نگرانی بھی اُن کو کرنی پڑتی تھی، انھوں نے رفتہ رفتہ مدرسہ کی ظاہری و باطنی ترقیوں کی کوششیں شروع کیں، مسٹر الما لطیفی سے اُن کے خیالات کا اتحاد نہ ہوا، بالآخر ایک دو سال کے بعد مسٹر الما لطیفی کی جگہ راس مسعود صاحب نے لی، اور انھوں نے اُن کے ساتھ مل کر کام شروع کیا،

مولانا شبلی مرحوم کی فرمائش سے نواب عماد الملک مرحوم نے قرآن پاک کے انگریزی ترجمہ کا جو کام شروع کیا تھا، وہ نصف کے قریب انجام پا چکا تھا، مگر اس میں جا بجا نقص تھے، نواب صاحب نے مولانا حمید الدین صاحب کی موجودگی سے فائدہ اٹھایا، اور مدت تک شغل جاری رہا، کہ مولانا روزانہ صبح کو نواب صاحب کے یہاں جاتے، اور نواب صاحب با این ہمہ ضعف و پیری انگریزی ترجمہ پرمحل کر غور کرتے، اور مناسب مشورہ ملنے پر اصلاح و ترمیم کرتے، اس طرح اُن کے ترجمہ کے کئی پاروں پر نظر ثانی ہوئی، پھر یہ کام رک گیا، لیکن یہ کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ نواب صاحب مرحوم کی وفات کے بعد یہ اصلاح شدہ اجزا اس طرح کاغذات میں مل گئے کہ پھر انکا پتہ نہ چلا، میں نے نواب صاحب مرحوم کے خلف الرشید نواب مہدی یار جنگ بہادر کو تحریری و زبانی کئی دفعہ انکی تلاش کی طر توجہ دلائی، مگر انھوں نے اُن کے ملنے سے یا یوسی ہی ظاہر کی،

مولانا شبلی مرحوم اس وقت سیرۃ نبوی کی پہلی جلد لکھ رہے تھے، یہود و نصاریٰ اور اہل کتاب کے مناظرانہ مسائل اور قرآن پاک کے استدلالات میں وہ برابر اپنے بھائی سے مشورے لیتے رہتے تھے، جو مکاتیب (۵۷-۵۳) سے ظاہر ہیں، سیرت جلد اول کے مقدمہ میں حضرت اسماعیلؑ کی سکو اور قربانی کے متعلق جو باب ہے، اس کا مواد مولانا حمید الدین ہی نے ہم پہنچایا تھا، جس کو آئندہ چل کر مولانا حمید الدین صاحب مرحوم نے بڑھا کر اور پھر اور زیادہ استقصاء کر کے المدای الصحیحہ فی من هو الیٰیج کے نام سے الگ شائع کر دیا،

(باقی)



## دربار عادل شاہی کا ایک مشہور مورخ

رفیع الدین شیرازی مصنف تذکرۃ الملوک،

از

جناب سید احمد اللہ صاحب قادری نائب ڈیڑ سالانہ تاریخ،

دکن میں جن باکمال ہستیوں نے علم تاریخ کی قابل قدر خدمات انجام دی ہیں ان میں رفیع الدین شیرازی کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے، رفیع الدین کے آبا و اجداد شیراز کے رہنے والے تھے، ۹۶۷ھ میں رفیع الدین وطن کو خیرباد کر کے دہلی میں چلے آئے، اُن کے والد بزرگوار کا نام نور الدین توفیق تھا، یہ بڑے عالم و فاضل آدمی تھے، جس زمانہ میں رفیع الدین دہلی میں وارد ہوئے تھے، اس وقت ہندوستان پر اکبر کے اقبال کا پرچم لہرا رہا تھا۔ اور دکن میں پانچ سلطنتیں برسرِ اقتدار تھیں جن میں بیجا پور واحد نگر اور گولکنڈہ کے فرمان روا خاص درجہ رکھتے تھے، خاص کرداد و پیش اور علمی فیاضیوں میں شاہانِ بیجا پور ان سب سے زیادہ مشہور تھے، اور ان کے نام کا سرکہ مشرق اور مغرب میں کیسان روان تھا، اسی باعث رفیع الدین بھی ۹۷۷ھ میں دہلی سے سید محمد انصاری آباد ساگر میں چلا آیا اور وہاں بیجا پور میں اگر سلطان علی عادل شاہ (۹۷۷-۹۸۵ھ) کے دربار میں باریاب ہوا، بادشاہ نے اس کو اپنے پاس خوان سالار کے عہدہ پر مامور فرما دیا، اور بعد میں منصب حوالدار سی محلات اور خزانہ داری لے بیجا پور کی ایک سرکار تھا۔ دیکھو سوانح دکن از مشہور مورخین ہمدانی مخطوطہ۔

کی خدمات بھی مزید عنایت کیں،

۹۸۵ھ میں یہ بیجا پور کے مقتدر امرا میں شمار کیا جاتا تھا، اور اس وقت بادشاہ کے حکم سے محل پرستیں کیا گیا تھا۔ جب ۹۸۵ھ میں کو سلطان علی عادل شاہ کا قتل ہوا تو یہ اور افضل خان شیرازی و دونوں بادشاہ کے فرودگاہ تک بلا پس و پیش داخل ہو گئے مگر جو وقت محل میں پہنچے، اس وقت بادشاہ خنجر کے صدمے سے گھائل ہو کر انتقال کر چکا تھا۔

افضل خان شیرازی بیجا پور کا وزیر اعظم اور رفیع الدین شیرازی کا برادرِ عظم زاد تھا۔

۹۸۵ھ میں جب سلطان ابراہیم عادل شاہ تخت نشین ہوا تو اس وقت شہزادہ کی عمر نو سال کی تھی۔ امرا نے وزارتِ عظمیٰ کی خدمت پر کامل خان دکنی کا تقرر کر دیا۔ اور چاند بی بی دکن سلطان علی عادل شاہ (شہزادہ کی نگران مقرر ہوئی۔ کامل خان نے ابتدا میں نہایت جاہل بازی اور مستعدی سے اس خدمت کو انجام دیا، لیکن بعد میں بعض امراء کے اغواء سے سرکش ہو گیا، اس وقت رفیع الدین نے مخاطب ملک کے لئے جو تدابیر اختیار کئے تھے، وہ تاریخ میں خاص الفاظ میں لکھے گئے ہیں۔

۹۸۵ھ افضل خان شیرازی ایران کا رہنے والا تھا جب رائج سال کا تھا، اُس وقت اس کا باپ مرگیا، ملا فتح اللہ شیرازی اس نے علوم کی تحصیل کی اور جب خود فاضل ہو گیا تو ہندوستان چلا آیا اور سلطان علی عادل شاہ کے زمانہ میں اپنے چند شاگردوں کو ساتھ لیکر بیجا پور آیا، اس باعث اس کی بادشاہ تک جلد شہرت ہو گئی، بادشاہ نے اسے اپنے ملازمین کے زمرہ میں شامل کر لیا، اور رفتہ رفتہ ترقی کرتے ہوئے اس نے بیجا پور کی وزارتِ عظمیٰ حاصل کر لی، یہ بڑا علم و دست شخص تھا اس کے دربار میں بڑے بڑے ارباب کمال جمع ہو گئے تھے، خود اس کا استاد ملا فتح اللہ شیرازی بھی اسی کے باعث دکن میں چلا آیا، اس کے علاوہ ملازمتیں افضل الدین، ملا صوفی، ملا طوسی اور مرشد قلی جیسے مشاہیر علمائے اس کے خاندان سے منسوب تھے، اس کے حالات دکن کی تمام تاریخوں میں کثرت سے ملتے ہیں،



رفیع الدین اس وقت خزانہ تھا کہ کل خان نے اس سے شاہی خزانہ سے جواہرات طلب کیے، جس پر یہ جواہرات کا صندوق لے کر کل خان کے پاس گیا۔ اُس نے ان میں سے نہایت اچھے اچھے اور بیش قیمت جواہرات ملجودہ کرے، اور انھیں دوسرے صندوق میں محفوظ کر دیا۔ رفیع الدین نے اس وقت جبری جرات کر کے ان تمام کی ایک فرو تیار کر لی، رفیع الدین کی یہ حرکت کل خان کو پسند نہیں آئی، اور یہ ناخوش ہو گیا، اس کے بعد رفیع الدین اور کل خان میں علانیہ طور پر مخالفت ہو گئی، رفیع الدین چونکہ افضل خان کا بھائی تھا۔ اس لئے کل خان اس کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچا سکا،

اس سبب کچھ ایسے سیاسی انقلابات پیش آئے، کہ کل خان کو چاند بی بی نے کشور خان سے قتل کر دیا، اس خدمت پر پھر افضل خان شیرازی کو مامور کر دیا۔ اب رفیع الدین کی کھان اور بلند ہو گئی۔ انھی دنوں میں نظام شاہی بادشاہ اور بیجا نگر کے راجاؤں نے متحد ہو کر عادل شاہ کے بعض ملاقوں کو تاراج کرنا شروع کیا۔ چاند بی بی نے افضل خان شیرازی کو سر شکر مقرر کر کے ان کے مقابلہ کو روانہ کیا افضل خان نے ان کو ایسی سخت اور فاش شکست دی، کہ مدت تک سر نہ اٹھا سکے،

افضل خان چونکہ مدافعت کے لئے بھیجا گیا تھا، چاند بی بی نے عارضی طور سے اس خدمت پر کشور خان کا تقرر کر دیا، کشور خان بھی بعض وجوہات کے باعث اس خدمت سے معزول کر دیا گیا جس کے بعد یہ خدمت اخلاص خان حبشی کے تفویض ہوئی، اخلاص خان اور افضل خان میں

بہت بجا پور کام اس مقام سے تھا، اس کا تذکرہ دکن کی سیاسی تاریخ میں مشرق سے نظر آتا ہے، اُس نے بیجا پور میں بہت کام کیا، انہیں دے دیں، مشرق میں مصطفیٰ خان کے ایک جان نثار کے ہاتھ سے مارا گیا، یہ بھی بیجا پور کے امراء کے ہاتھ سے قتل ہوئے، اس کے بعد اس کی لاشیں خانہ کو گئیں، مشرق میں مرتضیٰ آباد میں بہت قید انتقال کیا،

کسی بات پر رنجش ہو گئی تھی، دوسری وجہ اس کی صہمت کے بناء کی مورخین یہ بتاتے ہیں کہ اخلاص خان کا خیال تھا کہ دربار سے غیر ملکی امراء کا اثر توڑے اور سلطنت کو ان لوگوں سے محفوظ کرے اس ارادہ کی تکمیل کے لئے اسے پہلے اس نے افضل خان شیرازی کو ایک بہانہ سے قید کر دیا، رفیع الدین چونکہ اس کا بھائی تھا۔ اس لئے یہ بھی گرفتار کیا گیا، جب رفیع الدین قید کر کے جیل خانہ میں بھیجا گیا تو وقت افضل خان شیرازی بھی اسی جیل میں قید تھا۔ اس کا یہ عالم تھا کہ دونوں ہاتھوں میں ہتکڑیاں پہنی ہوئی تھیں، اور گھٹے میں طوق اور پاؤں میں پیریاں ڈالی گئی تھیں، رفیع الدین اس واقعہ کو اپنی تصنیف تذکرۃ الملوک میں بڑے اندوہ کن طریقہ سے بیان کرتا ہے،

ابراہیم زبیری نے بھی اس سانحہ کو بساتین السلاطین میں لکھا ہے:-

”جب رفیع الدین جیل خانہ میں بری طرح ڈالا گیا تھا، اس کا بھائی بھی وہاں موجود تھا، اسکی حالت اس وقت بہت نازک تھی اور وہی پریشان کیا تھا، رفیع الدین اس آفت آسمانی کو دیکھ کر زار و قطار رونے لگا، اور کہنے لگا کہ کل درود یار جبکہ آگے صفت بستہ تھے اور جبکہ پیر زمین پر کبھی نہیں پڑتا تھا، آج اس کا یہ عالم ہو گیا،

رفیع الدین کے پہنچنے کے کوئی ایک ساعت بعد کئی آدمی جیل خانہ میں داخل ہوئے، اور افضل خان کو کپڑا کر باہر لے آئے، اور اُسی روز اسے عین بازار میں قتل کر دیا، نعش دو روز تک بازار میں پڑی رہی تیسرے روز شاہ فتح اللہ شیرازی کے آدمیوں نے اُسے اٹھا کر دفن کر دیا۔ اگرچہ رفیع الدین بھی اسی دن قتل کر دیا جاتا، مگر بعض امراء نے بڑی سعی و کوشش کر کے اُسے بچا لیا، اور چند دن کے بعد قید

لے فتح اللہ شیرازی اپنے زمانہ کے بڑے متبحر عالم تھے، جن کو عقل مادی عشر بھی کہا کرتے تھے، افضل خان شیرازی کی سعی کے باعث شیراز سے بیجا پور میں آئے، اور افضل خان کے انتقال کے بعد دکن چھوڑ کر مشرق میں دہلی چلے گئے، اور اکبری ملازمین میں داخل ہو کر عضد الدولہ کے خطاب سے سرفراز ہوئے، شوال ۹۹۹ھ میں اکبر کی محبت میں سری نگر کشمیر میں انتقال کیا، اکبر کو اس واقعہ کا بہت رنج ہوا۔ اور فیضی نے اس واقعہ پر ایک مرثیہ لکھا،



سے بھی رہا کر دیا گیا، اور اس کی قدیم خدمت پھر بحال ہو گئی۔

سنہ ۱۱۹۰ کے اوائل میں دلاور خان اور اخلاص خان حبشی میں کچھ آویزش ہو گئی اور دلاور خان نے بعض امراء کو اپنا شریک بنالیا۔ اور حمید خان بھی اسی کا ہم راز ہو گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دلاور خان اور اخلاص خان حبشی میں جنگ و جدال شروع ہو گیا، حمید خان لڑائی جھگڑوں کو نہایت مذموم تصور کرتا تھا۔ اس نے رفیع الدین شیرازی، حمید خان، شیخ سالم اور مولانا دوست محمد خان کو اپنے سفیر بنا کر اخلاص خان حبشی کے پاس صلح کے لئے روانہ کیا، لیکن اخلاص خان نہایت تیز مزاج اور سخت آدمی تھا۔ اس نے صلح نہیں کی، جس کے باعث رفیع الدین کو بے نیل مرام واپس ہونا پڑا۔

حضرت امین سلطان ابراہیم عادل شاہ نے رفیع الدین کو اپنی جانب سے سفیر مقرر کر کے احمد نگر میں امن قائم کرنے کے لئے چاند بی بی کے پاس بھیجا۔ اس زمانہ میں احمد نگر کے امراء نہایت سرکش اور باغی ہو گئے تھے، رفیع الدین پہلے شاہ درگ میں پہل خان کے پاس گیا، پہل خان اور بادشاہ میں کچھ بخشش ہو گئی تھی، اس نے بادشاہ کی طرف سے پہل خان کا دل صحت کر دیا، یہاں سے احمد نگر گیا، احمد نگر کی حالت اس وقت نہایت خراب تھی حتی الامکان اس نے قیام امن کی تدابیر اختیار کئے۔ امراء میں اور چاند بی بی میں دو تین دفع صلح بھی کرادی۔ لیکن شورش پسند امراء نے پھر لڑائی جھگڑے شروع کر دیے، رفیع الدین ان قضیوں کی کیسوئی کے لئے تقریباً چودہ ماہ تک احمد نگر میں مقیم رہا۔ لیکن جب امن کی کوئی صورت نہ دیکھی تو مجبور ہو کر اس نے یہاں کے سارے حالات

سنے بجا پور کے جلیل القدر امراء سے تھا، بڑا سیدھا اور صاف گو امیر تھا۔ بعد میں اس سے اور دلاور خان سے لڑائی ہو گئی، شاہ ابراہیم عادل شاہ کی فوج کا سپہ سالار تھا۔ اس نے مغلوں کے مقابلہ میں بڑی ناموری حاصل کی تھی۔ بادشاہ نے اسے امتداد الدولہ کا خطاب سرفراز کیا تھا، رفیع الدین نے تذکرۃ الملوک میں لکھا ہے کہ اس کا بار بار بادشاہی دربار سے کسی طرح کم نہیں ہے اس کے حالات ہستائیں کے مصنف نے بھی تفصیل کے ساتھ لکھے ہیں،

ابراہیم عادل شاہ کے پاس لکھ بیٹھے جس پر بادشاہ نے اسے بجا پور آنے کا حکم دیا، اس کے بعد پٹنہ کے وسط میں بجا پور چلا آیا۔

اس کے قیام احمد نگر کے زمانہ میں چاند بی بی اسے دوسرے تیسرے روز برابر یاد کیا کرتی تھی۔ اور اس کے استقبال کے لئے نظام شاہیوں کی جانب سے ایک سرسبز نوبت بھیجا جاتا تھا۔

رفیع الدین کے احمد نگر سے واپس ہونے کے بعد بادشاہ نے اس کے ساتھ خاص مراعات کیں اور کچھ عرصہ کے لئے یہ بجا پور کا حاکم بھی بنا دیا گیا اور سلطان نے اسے شہزادہ محمد عادل شاہ (سنہ ۱۱۹۰ء) کا اتالیق مقرر کیا، اس نے ملک کی بہت سی اصلاحیں کیں، جنگا تذکرہ دکن کی تمام عمومی تاریخوں میں ملتا ہے،

رفیع الدین شیرازی کی شہور تصنیف تذکرۃ الملوک ہے، جو دکن میں خاص عزت کی نظر سے دیکھی جاتی ہے، رفیع الدین نے سنہ ۱۱۹۰ء میں تذکرۃ الملوک کو لکھنا شروع کیا، اور سنہ ۱۱۹۰ء میں چار سال کی قلیل مدت میں اتمام کو پہنچایا، یہ نو ابواب پر مشتمل ہے، جس کی تفصیل حسب ذیل ہے،

باب اول، سلاطین ہمنہ کے حالات اور ان کے محاربات، اُن زمانہ کی سیاست پر تبصرہ، محمود گادان کے سوانحیات، بہمنی خاندان کے چودہ بادشاہوں کا تذکرہ، جن میں آخر کے چار بادشاہ (احمد شاہ رابع، علاء الدین، ولی الدین، کلیم اللہ) شامل نہیں ہیں۔

باب دوم، تذکرہ یوسف عادل شاہ اور اس کا سلسلہ نسب،

باب سوم، تذکرہ اسماعیل عادل شاہ،

باب چہارم، تذکرہ ابراہیم عادل شاہ اول، راجگان بجا نگر کی تاریخ اور

ان سے لڑائیاں،



**باب پنجم** علی عادل شاہ کی تاریخ جلوس اور ابتدائی سرکے، رآتم راج والی  
بیجا نگر اور علی عادل شاہ کا حملہ احمد نگر (۹۶۲ھ تک)

**باب ششم** شاہان گجرات کی تاریخ، اور شاہ اکبر کی دکن کی فتوحات نظام  
شاہی اور قطب شاہی بادشاہوں کی تاریخ، چاند بی بی کی شادی تالیکوٹ کی لڑائی، فتح بیجا پور  
تک کے مسلسل واقعات (۹۶۲ھ)

**باب ہفتم** سلطان علی عادل شاہ کی وفات (۹۶۲ھ) آس کے بھائی افضل خان  
کی سرگذشت (۹۶۲ھ) علی عادل شاہ کے بعض اذکار،

**باب ہشتم** سلطان ابراہیم عادل شاہ کے حالات، اس زمانہ کی سیاست پر تبصرہ  
سرگم آریان، اور رفیع الدین شیرازی کی سیل خان کے پاس شاہ درگ کو روانگی، چاند بی بی کی  
طبی پراحمہ نگر کی جانب کوچ،

**باب نهم** سلاطین مغلیہ کے حالات شہنشاہ بابر (۹۶۲ھ) سے نور الدین  
جہانگیر کے جلوس تک (۹۶۲ھ) سلاطین صفویہ کی تاریخ شاہ عباس صفوی کے حالات، دکن  
سے صفویوں کی راہ و رسم شاہی، ملک عنبر بخشی (وفات ۹۶۲ھ) راجہ کنی کے تذکرے، ایہورے  
کے غارت گن پر شاہزادہ پرویز بن جہانگیر کی مانت و تازی یعنی حملہ اسیر گڑھ،

تذکرۃ الملوک سلاطین بیجا پور کی نہایت مبسوط اور مستند تاریخ ہے اور فرشتہ کی تاریخ  
پر بھی اہمیت رکھتی ہے، اس کا مصنف جس قدر بار سوخ واقع ہوا تھا۔ فرشتہ کو بیجا پور میں  
وہ وجہ حاصل نہیں تھا، بلکہ یہ خود اسی کے خانوادہ سے کاغذ شہین تھا۔ فرشتہ ابتدا میں احمد نگر  
میں رہا کرتا تھا۔ ۹۶۲ھ میں یعنی سلطان علی عادل شاہ کی وفات کے دس سال بعد بیجا پور میں آیا،  
اور سلطان ابراہیم عادل شاہ کے حکم سے تاریخ لکھنا شروع کی اور ۹۶۲ھ میں ختم کیا یہاں تک اس کے

رفیع الدین شیرازی بیجا پور میں ۹۶۲ھ سے مقیم تھا، اس نے علی عادل شاہ کو بھی دیکھا تھا، اور اس کی برکت  
ملازمت کی تھی اس بنیاد پر جیسا کہ یہاں کے حالات سے یہ باخبر تھا کوئی اور دوسرا مورخ ایسا واقع  
نہیں تھا، فرشتہ بیجا پور میں آنے کے تقریباً دس پندرہ سال بعد تاریخ فرشتہ کو ترتیب دینا شروع کیا  
برخلاف اس کے رفیع الدین نے بیجا پور میں سال کے تجربات کے بعد اپنی کتاب کی بنیاد رکھی، فرشتہ  
نے عادل شاہیوں کے کوائف کے لئے صرف چند صفحات وقف کئے ہیں، لیکن رفیع الدین نے پوری  
کتاب انھی بادشاہوں کے حالات میں لکھی ہے،

شاہان بیجا پور کے متعلق جس قدر مفید معلومات تذکرۃ الملوک سے اخذ ہو سکتی ہیں، وہ کسی اور  
تاریخ سے میسر نہیں ہو سکتیں،

تذکرۃ الملوک کے تصنیف ہونے کے بعد جس قدر مصنفین نے بیجا پور پر لکھا ہے، ان سبھوں نے  
قریب قریب تذکرۃ الملوک سے فائدہ اٹھایا ہے،

۹۶۲ھ میں محمد ابراہیم زہیری نے بساتین السلاطین کے نام سے بیجا پور کی ایک تاریخ لکھی ہے،  
اس کا سب سے بڑا خد تذکرۃ الملوک ہے اور بعض جگہ اس سے اصل عبارتیں بھی نقل کر لی ہیں، یہ کتاب  
انگریزوں کے بیجا پور پر تسلط پانے تک کے حالات پر مشتمل ہے،

ملاحظہ فرمائیے ملاظہوری نے محمد نامہ میں رفیع الدین کو دوبارہ تاریخ لکھا ہے،  
یہ گنگ (M. KING) نے برہان المآثر سے صرف سلاطین ہند کے حالات ترجمہ کیے تھے  
اس میں ضمتا تذکرۃ الملوک کے مختلف اجزاء جو ہندوؤں سے تعلق رکھتے ہیں شامل کر دیے ہیں، یہ مضمون انڈین  
انٹی کویری میں شائع ہوا تھا اسکے بعد لوزک کمپنی لندن نے اسے بصورت کتاب سنہ ۱۸۶۲ء میں شائع کیا ہے،  
تذکرۃ الملوک کا ایک نہایت نفیس اور خوشخط نسخہ ہمارے یہاں موجود ہے جس کو ہم عنقریب  
شائع کرنے والے ہیں، اور اس کا بہت بڑا حصہ چھپ چکا ہے،



# روضہ تلج محل کی تعمیر

اور

## اُس کے طراح و معمار

از مولوی عبداللہ صاحب چغتائی، لکچرار اسلامیہ کالج لاہور،

مولوی عبداللہ صاحب نے گزشتہ سال عثمانیہ یونیورسٹی کی مجلس تالیف کے وہ سالہ جشن میں

اس موضوع پر ایک مضمون پڑھا تھا جس کا اختصار یہ ناظرین ہے، مولوی صاحب عنقریب

اس مضمون کو ایک مستقل کتاب کی صورت میں مع تصاویر شائع کریں گے۔

”معارف“

ارجنہ بانو بیگم جو ممتاز محل کے لقب سے مشہور ہے آصف خان امین الدولہ بن مرزا غیاث بیگ

طہرانی کی لڑکی تھی، سنیہ مطابق سنہ ۱۰۵۹ء میں پیدا ہوئی، اور ۱۹ سال کی عمر میں سنہ ۱۱۰۸ء میں شاہ

جہان کے ساتھ جب کہ شاہ جہان کی عمر تقریباً ۲۱ سال کی تھی اسکی شادی ہوئی، اس کے بطن سے کل ۱۲

اولادین پیدا ہوئیں جن میں سے آٹھ لڑکے اور چھ لڑکیاں تھیں اور رنگ زیب عالمگیر اسکی بطن سے تھا،

اس نے برطان پور میں ۱۱۰۸ھ یقینہ سنہ ۱۱۵۵ھ مطابق ۱۵ مئی ۱۷۴۲ء کو انتقال کیا، بے بدل

خان نے نہایت عمدہ تاریخ وفات لکھی ”جائے ممتاز محل جنت باد“ ملا عبدالحمید لاہوری کا بیان ہے

کہ بادشاہ پر اس صدمہ نے جانکاہ کا اس قدر اثر پڑا کہ تھوڑے ہی دنوں کے بعد فراغ غم سے تمام بال سفید

ہو گئے، اور شاہد صاحب کہوہ اس پر یہ اضافہ کرتا ہے کہ اس حادثہ کے بعد ہر سال جب ذیقعدہ کا مہینہ

آتا تو بارگاہ شاہ جہان میں تعزیت کا سامان ہوتا بادشاہ سفید پوش اور تمام اہل مائت لباس میں جلوہ

ہوتے پہنچ ہے،

غم بادشاہان غنیم کشورست

اول اول اسکی لاش کو برہانپور ہی کے باغ زمین آباد میں امانتہ دفن کیا گیا لیکن بعد میں ۱۱۰۸ھ

سنہ ۱۱۵۵ھ میں اُس کو اکبر آباد میں منتقل کر لیا گیا اور ۱۵۰۵ھ مطابق ۱۱۵۵ھ سنہ ۱۱۵۵ھ کو

۱۱۰۸ھ تک اُس کو صحن باغ میں امانتہ سپرد خاک کیا اس کے بعد وہ اصل مقبرہ میں جواب تاج محل کے

نام سے مشہور ہے دفن کی گئی،

بادشاہ نے اُس قطعہ زمین کو جہان اس وقت مقبرہ نظر آتا ہے راجہ جے سنگھ خیرہ راجہ مان سنگھ

سے حاصل کیا اور اس کے عوض اُس کو ایک دوسرا وسیع قطعہ زمین عنایت کیا، بظاہر اس مقام کے انتہائی

کے دو سبب معلوم ہوتے ہیں، ایک تو یہ کہ وہ دریا سے جہان کے کنارے واقع ہے، دوسرے یہاں

سے قلعہ کا منظر اور قلعہ سے یہاں کا منظر نہایت واضح طور پر نظر آتا ہے،

روضہ ممتاز محل کی تعمیر سنہ ۱۱۵۵ھ میں شروع ہوئی اور سنہ ۱۱۵۵ھ میں پورے بارہ سال میں تکمیل

کو پہنچی تکمیل کے بعد بادشاہ خود امرار و مقبرہ میں دربار کے ساتھ اس کے دیکھنے کے لیے تشریف لائے اور

جیسا کہ بادشاہ نامہ و عمل صراح میں مذکور ہے غبار و مساکین کو خیرات کثیرہ سے بیگم کی یاد میں الا مال کر دیا

اس روضہ کے متعلق ایک معصومہ کا خیال ہے کہ شاہ جہان کی آنکھوں میں بیگم کی وفات سے جو آنسو بحر

آئے اُن میں سے ایک قطرہ منجمد ہو کر سنگ مرمر کے روضہ میں تبدیل ہو گیا، یہ تو ایک شاعرانہ خیال

ہے، لیکن درحقیقت یہ روضہ دنیا کی عمارتوں میں بے مثل تسلیم کیا گیا ہے، اور اسی بنا پر فرانسیسی ”اطالوی“

ارمنی، پرتگالی وغیرہ سب اسکی تعمیر کا فخر حاصل کرنا چاہتے ہیں، اور انھوں نے اپنی پوری طاقت یہ ثابت

کرنے کے لیے صرف کر دی ہے کہ یہ روضہ ادنیٰ کے ملک کے صناعتوں کا بنایا ہوا ہے، لیکن یہ دعویٰ

بالکل بے بنیاد ہے، اور ہم اسکی تردید نہایت تفصیل کے ساتھ کرنا چاہتے ہیں،



## شاہجہان بحیثیت ماہرین تعمیر

جن تعمیر کا سب سے بڑا دلدادہ نور الدین جہانگیر شاہ تھا، اس لیے اُس کے لڑکے شہزادہ خرم میں جو بعد کو شاہ جہان کے لقب سے مشہور ہوا ابتدا ہی سے فن تعمیر کا ذوق پیدا ہو گیا تھا یہی وجہ ہے کہ شالامار باغ کشمیر کی تعمیر کا اہتمام جہانگیر نے جیسا کہ تزک جہانگیری اور عمل صالح دونوں میں شہزادہ کے سپرد کر دیا تھا خوش قسمتی سے تاج کی تعمیر سے پہلے دور و ضے جو اس سلسلے میں اہمیت رکھتے ہیں تعمیر ہو چکے تھے یعنی دہلی میں مقبرہ ہمایوں اور لاہور میں مقبرہ جہانگیر اول الذکر تو بغیر میناروں کے تعمیر ہوا ہے جس کے درمیان میں نصف کر دی شکل کا ایک گنبد ہے جس کے متعلق عام خیال یہ ہے کہ تاج اسی کے نمونہ پر تیار ہوا اور دوسرا جہانگیر کا مقبرہ جس میں درمیانی گنبد تو نہیں ہے مگر چاروں کونوں پر مینار موجود ہیں، مہر مورخین کا بیان ہے کہ سنہ ۱۶۳۱ء میں جب تعمیر شروع کا انتظام شروع ہوا تو اس وقت ممتاز بیگم کا باپ باوجود ناسازی صحت کے شاہ جہان کے ہمراہ تھا، اور بیان کیا جاتا ہے کہ بادشاہ نے ماہرین فن سے مشورہ کیا اور مشورہ کے بعد ایک لکڑی کا نمونہ بنا کر بادشاہ کے سامنے پیش کیا گیا جو بعد میں منظور ہوا اور اسی نمونے پر روضہ کی تعمیر ہوئی،

### تاج کے معمار

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ روضہ کی بنیاد کس نے ڈالی؟ معاصر مورخین شاہجہان ملا عبد الحمید لاہوری اور محمد صالح کبیرہ دو شخصوں کے نام بتاتے ہیں، ایک میر عبد الکریم اور دوسری ملا مرشد شیرازی جو جہانگیر کے عہد میں ہندوستان آیا اور جسے مکرمت خان کا لقب دیا گیا اور اسی کے زیر اہتمام تاج تعمیر ہوا ایک اور تیسرا نام امانت خان شیرازی طغرانیوں کا بھی ملتا ہے، چنانچہ تاج کے اندر یہ کتبہ کندہ ہے "فقیر الخیر امانت خان شیرازی فی سنہ ۱۰۳۰ھ ہزار چیل و ہشت ہجری ۱۶۲۱ء

## دوازدہم جلوس مبارک

سٹریٹو بلویناٹن آفٹینڈ نے ۲۷ مئی ۱۹۲۳ء کے اسٹیشن میں "تاج کے طرہین اور عام مخالطے" کی سرخی سے ایک طویل مضمون سپرد قلم کیا تھا، جس میں وہ چند معماروں کے نام اور بتاتے ہیں، چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ تاج کی بنیاد ایک ایرانی محمد علیی آفندی نے ڈالی جس کے ساتھ امانت خان شیرازی، محمد حنیف بغدادی اور ہندو خان (مخلص خان) ایرانی شریک تھے، سنگ بنیاد سے لیکر چوٹی تک تاج بالکل اسلامی طرز رکھتا ہے اور اس میں دشمنی یا فلورنسائی طرز کا شائبہ نہیں ہے۔

تاج کے علاوہ شاہ جہانی عہد میں جو عمارتیں تعمیر ہوئیں، وہ بھی ان ہی بعض کے زیر اہتمام تعمیر ہوئیں، چنانچہ قلعہ لاہور کا دروازہ جو عہد شاہجہان میں سنہ ۱۶۳۱ء میں از سر نو تعمیر ہوا، اسکی پیشانی پر ایک بہت بڑا کتبہ اشعار میں ہے، اور اس کے آخر میں بابا تمام میر عبد الکریم لکھا ہے،

بندہ کیدل مرید محقق عبد الکریم،

بعد اتمام غارت یافت این تاریخ سال

دائما چون دولت این بادشاہ جم سپاہ

این ہمایوں برج عالی بار از آفت زوال

سنہ ۱۰۳۱ھ جلوس

اور شاہ جہان آباد دہلی کا قلعہ مکرمت خان کے اہتمام سے تعمیر ہوا جس کی عام تاریخی کتابوں سے تصدیق ہوتی ہے، چنانچہ خانی خان اپنی تاریخ منتخب الباب ۶۲ میں لکھتا ہے کہ "علی مردان خان نے پشاور میں ایک مقف بازار اصفہان کی طرز پر تعمیر کیا اور اس کے کونوں پر شمشیر برج بنوائے، اس کا مطرح اُس نے مکرمت خان شیرازی کے پاس دہلی روانہ کیا جبکہ قلعہ دہلی اس کے زیر اہتمام تعمیر کیا جا رہا تھا،

ان تمام معماروں کے علاوہ شاہجہان اور ممتاز بیگم کے والدین الدولہ کا ذوق تعمیر اس پر ستر



تھا چنانچہ سال مہتمم سلطنت کے تعمیر جاتے ہوئے جب شاہ جہان لاہور سے گزرا ہے اور دارالسلطنت لاہور کے  
 قلعہ میں جہلی تیرہ بیویوں کی خواہش کی ہے تو محمد صالح کبیرہ نے اس کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے :-  
 "پس از پرہ اخت این معانی بمرست اندیشی عمارات دولت خانہ دارالسلطنت کہ از دیر باز کے بن  
 نہ پر دستہ بود تو جو تمام مہندوں و استاد بنا پر ان کے عمارات غسل خانہ و خواجگاہ در اصل باعتبار طرح و  
 وضع دل پسند و خاطر خواہ آنحضرت بود معماران ہند سر پر داز حسب الامر اعلیٰ بنا زگی طرحائے خوب  
 نظر فریب رقم نمودہ از نظر مشغول پسند گذاریدند و رنگ ریختن و بنا و تہادون با تمام رسانیدن طرحی  
 گذران جو مختار و تادہ بود با اہتمام و دیر خان و سائر مقتدیان لاہور باز گذارند و طرح عمارات  
 شاہ برج کہ در ہند حضرت جنت مکانی طرح انگندہ اسامی آنرا از رنگ طرحائے تازہ کہ بخاطر  
 اقدس رسیدہ بود ریختند و طرح کیمیت و کیفیت آنرا میں الدولہ کہ در باب طراحائے و تصرفات  
 دریں مرقوم و دارو حسب الامر اعلیٰ از دستخط خود بر جان طرمار طرح ثبت کردہ ہند سان سپرد کہ  
 عمل آن دستور مکمل را دستور العمل سازند"

اور ان سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ دونوں فن تعمیر کے کس قدر ماہر تھے اور ایرانی طرز پر کام کرنے والے  
 کس قدر ماہر فن معمار و بار میں موجود تھے ان تاریخی روایات کے علاوہ تاج میں بعض ایسی اندرونی خصوصیات  
 موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ خالص اسلامی طرز کی عمارت ہے اور اس کو مسلمان معماروں نے تعمیر  
 کیا ہے۔ مثلاً

## گنبد

جس کی نسبت میراجال ہے کہ مشغول سے کوئی شخص مجھ سے اس بات میں اختلاف کرے گا کہ تاج محل  
 غالباً ہندوستان میں پہلی عمارت ہے جس میں مسلمانوں نے دو برابر بلب نما تاج کاری گنبد بنایا۔ اگرچہ تاریخ  
 اس بات کو بالکل واضح نہیں کرتی کہ تاج واقعی علی مردان خان کا طرح کردہ تھا، مگر یہ بات قابل غور ہے

کہ تاج کی عمارت ان اسلامی عمارات سے بالکل مشابہت اور مطابقت رکھتی ہے جو کہ شیراز اور سمرقند میں  
 اس وقت تعمیر کی گئی تھیں۔ ایران میں ہم بے شمار ایسی عمارات دیکھتے ہیں جو تاج سے مشابہ ہیں اور جن میں  
 غالباً ایرانی مسلمانوں نے تعمیر کیا۔ غالباً انہیں روایات کے تحت میں تاج میں گنبد خصوصیت سے بتایا  
 کیا گیا اور اسی گنبد پر تمام عمارات کا انحصار ہے جیسا کہ تبتاد کی جامع مسجد میں جو کہ ابو جعفر المنصور عباسی  
 کی بنا کر وہ ہے اور جس کی تعمیر کہا جاتا ہے کہ بعد میں ہوئی وہی بلب نما گنبد نظر آتا ہے۔  
 مگر اس قسم کا سب سے بڑا نمونہ جو شاہ جہان کے سامنے تھا وہ ان کے اپنے ابوالکلا بتیور کا مقبرہ تھا  
 جو شہر حین سمرقند میں تعمیر ہوا تھا اس مقبرہ کے گنبد کی اندرونی بناوٹ اور ساخت بالکل تاج کے  
 گنبد سے ملتی جلتی ہے اس کے علاوہ ترکستان میں تبتیور کی مسجد اس کے روضہ کی تعمیر سے ایک سال پہلے  
 تیار ہوئی وہ بھی تاج کے مشابہ ایک گنبد لیے ہوئے ہے۔ تبتور کے روضہ کے معمار اعلیٰ کا نام محمد بن محمود ہندوستانی  
 اور اس کی مسجد کے معمار کا نام خواجہ حسین شیرازی تھا، غرض کہ ہمارا خیال کہ ان ایرانی عمارات کو خالص  
 ایرانی مسلمانوں نے تعمیر کیا ہے اس اندرونی شہادت سے بالکل واضح ہو جاتا ہے۔

ہمیں اس تاج کے گنبد کا بلب نما نمونہ دو ہری حالت میں سواسے دمشق اور ایران کے اور  
 نہیں ملتا جو کہ اس تاج سے پہلے تعمیر کئے گئے۔

## نظرہ پرچین کاری

غرض کہ ان تمام شہادتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ تاج کی تعمیر میں کسی یورپین معمار کو دخل نہیں ہے، لیکن  
 تاج میں پرچین کاری کا جو کام پایا جاتا ہے اسکی بنا پر بعض یورپین مورخین کا خیال ہے کہ یہ صنعت اطالوی معمار  
 کا کارنامہ ہے۔ چنانچہ سٹرنفگن اپنی تاریخ میں صفحہ ۳۰۶ پر تحریر کرتے ہیں،

"ابتداء سے امدی عیسوی میں اطالوی فن کار خصوصیت سے فلورنس سے ہندوستان میں آئے  
 گئے اور یہ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے ہندوستانیوں کو سنگ مرمر میں کھود کر پرچین کاری کرنا اور اس میں قیمتی



پتھر جبرنا سکھایا

لیکن مشر برچیس اس کی تردید میں لکھتا ہے :-

”اگرچہ ہندوستان میں مغلیہ خاندان کے دو آخری بادشاہوں کے زمانہ میں اطالوی حسن کار خد مت  
میں تھے مگر کوئی خاص شہادت نہیں کہ وہ کسی اعلیٰ منصب پر سرفراز تھے، جبکہ حسن کاران شیراز بغداد اور بغداد  
قنوج جو اپنے فن میں بہت ماہر اور کامل تھے دورانِ تعمیر تاج میں موجود تھے، بہت ممکن ہے کہ تاج محل  
کی علی مردان خان نے طرح ڈالی ہو۔“

اس اطالوی نظریہ کی تردید میں سر جان برٹوڈ اپنی کتاب انڈین آرٹس میں لکھتے ہیں :-

”تاج کی پرچین کاری ہرگز فلورنس کی طرز کی نہیں ہے، بلکہ ہندوستانی مغل زمانہ کی پسندیدگی کے  
مطابق ہے، شاہجہان شہنشاہ ہند کے علاوہ کسی دوسرے غیر ملکی حسن کار کے علم اور ذوق کا ہرگز ہرگز نتیجہ نہیں ہے  
اس کی تائید میں سر جان مارشل اپنی رپورٹ سنہ ۱۹ء میں مانڈو کے بیان میں لکھتے ہیں :-

”پرچین کاری معمولی حالت میں بہ نسبت اس کے جو آج تک معلوم ہوئی ہے روضہ خلی پر مانڈو وسط  
ہند میں ہے، اس کو اطالوی فن قرار دینا ٹھیک نہیں ہے کیونکہ محمود غلی جس کی یاد میں یہ روضہ بنایا گیا  
میں فوت ہوا تھا۔“

ان اقتباسات سے پرچین کاری کا غیر اطالوی ہونا ثابت ہو گیا، ان تین ماہرینِ اثریات ہند  
نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ مسلسل ملازمت ہندوستان میں گزارا ہے، ان سب کی تحقیقات کا یہی نتیجہ نکلتا  
ہے کہ پرچین کاری میں ہرگز ہرگز کسی یورپین یا غیر ملکی ماہر فن نے حصہ نہیں لیا، اور نہ کوئی غیر ملکی ماہر فن  
ہذا اس وقت یہاں موجود تھا، بلکہ اگر وہ ہی میں ممتاز محل کے جدِ امجد اعتماد الدولہ کا جو روضہ ہے اس پر جو پرچین

ملے یہ اگرچہ درست ہے کہ علی مردان خان بہت بڑا مہذب وقت تھا مگر اس کا تاج کے نقشہ سے کوئی تعلق نہیں ہے کیونکہ  
ہندوستان میں سنہ ۱۶۰۰ء میں کیا جبکہ تاج کی عمارت کو شروع ہوئے ۸ سال ہو چکے تھے۔

کا کام ہے وہ اس بات کی صاف دلیل ہے کہ ہندوستان کے لوگ روضہ تاج محل کی تعمیر سے پہلے ہی اس  
فن کے بہت بڑے ماہر تھے۔

مشر ڈیوٹاٹن ہافٹنڈ نے ۲۴ مئی ۱۹۲۳ء کے اسٹیشن (STATESMAN) میں تاج کے طرز  
اور عام معانی کی سرخی سے ایک طویل مضمون سپرد قلم کیا تھا، اس میں وہ لکھتے ہیں :-

پرتگالی پیشوایان مذہب سائین میترق اور جوزن ڈی کا سٹروڈ کی سند سے ہمیں باور کرایا جاتا  
کہ اگرہ کے تاج کی طرح ایک اطالوی جیرو وروڈو وروڈو نے ڈالی اور پرچین کاری (PIETRADURA)  
کی آرایش فرانسیسی انگلیاں ڈی بورڈو کی نگرانی میں کرائی گئی، میرا اپنا یہی عقیدہ تھا، میں نے اپنے دوران  
قیام اگرہ میں اس کا بغور مطالعہ کیا،

غالباً یہ فرانسیسی وہی ہے جسے شاہجہان نے وجیانگر کے تخت کے نمونہ کا تخت طاؤسی بنانے کے لیے  
مقرر کیا تھا، مگر کوئی شہادت قابلِ اطمینان دستیاب نہیں ہوئی کہ اس نے تاج کی طرح ڈالی یا اس کے  
دورانِ تعمیر میں نگرانی کا کام سرانجام دیا، یہ فن تعمیر ایرانی وستان سے تعلق رکھتا ہے، اگر یہ کام اس فرانسیسی  
سے سرانجام ہوا ہوتا تو اس کے ہم وطن برنیز تو نو، یوریز وغیرہ اپنی کتابوں میں ضرور اس کا تذکرہ کرتے  
اور بالخصوص مؤخر الذکر جس نے اپنے عہد کا مفصل حال لکھا ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ اطالوی شخص  
بمسلسلہ ملازمت مغلیہ خاندان کے زمانہ میں یہاں موجود تھا، اور اسی نے سنہ ۱۶۰۰ء میں انتقال کیا اور پرانے قبر  
میں اگرہ میں دفن کیا گیا، جہاں اب بھی اس کی قبر موجود ہے، تاج کی طرح ایک ایرانی محمد عیسیٰ آفندی  
نے ڈالی جس کے ساتھ امانت خان شیرازی محمد حنیف بخدادی اور ہندس خان (مخلص خان) ایرانی شریک  
تھے، سنگ بنیاد سے لیکر چوٹی تک تاج بالکل اسلامی طرح رکھتا ہے اور اس میں دینی یا فلورنسادی  
طرز کا شائبہ بھی نہیں ہے،

مشر فنیسم آجہانی نے کچھ دنوں قبل مجھے اگرہ سے لکھا تھا :-



”مین آپ کے ساتھ اس خیال میں متفق ہوں کہ تاج کی طرح انداز سی یا تعمیر کے ساتھ ایک اطالوی یا فرانسیسی کے نام کی وابستگی بالکل بے بنیاد دلائل پر مبنی ہے، اس کے دونوں پہلوؤں کے متعلق بہت کچھ کہا جا سکتا ہے، مگر میرے ہاں ایسا مواد ہے جو اس نظریہ کا جواب پیش کرنا چاہتا ہے، میری بھی وہی رائے ہے جو آپ کی ہے، دونوں غیر ملکی ناموں کو تاج کی طرح انداز سی سے کسی زمانہ میں مین بھی کچھ تعلق نہیں رہا، اور یہ کہ اس کا طراح اور معمار استاد عیسیٰ ہی ہے جیسا کہ اگرچہ مین مشہور ہے تاج کا خاکہ بالکل اسلامی یا مشرقی ہے

حال ہی میں اطلاع ملی ہے کہ ترکی کے فاضل محمد ثریا نے ایک کتاب محل عثمانی کے نام سے شائع کی ہے، اس میں محمد عیسیٰ کی مکمل سوانح عمری لکھی ہے، افسوس ہے کہ وہ کتاب دستیاب نہ ہو سکی،

**ہم عصر یورپین سیاحوں کی رائے**

شاہجہان کے عہد میں تین سیاح کے اسماء ملتے ہیں، اور ان میں سے دو کے سفر نامہ مطبوعہ بھی ملتے ہیں، لیکن ان میں سے جیسا کہ متذکرہ بالا بیانات میں دیگر یورپین نقادان فن نے بھی ہماری تائید کی ہے، کسی یورپین صاحب فن کا تاج کی تعمیر کے سلسلہ میں نام نہیں ملتا۔ بلکہ خود ان سیاحوں کی مندرجہ ذیل رایوں سے جو کچھ واضح ہوتا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے،

(۱) مونیوٹونو (THE NENOT) یہ عجیب و غریب عمارت اس امر کا کافی ثبوت ہے کہ ہندوستان کے باشندے فن تعمیر سے نا آشنا نہیں ہیں، اگرچہ طرز تعمیر یورپ کے لئے اجنبی ہے، یہ اعلیٰ مذاق ہے اور یونانی یا دوسرے قدیم فن سے متیز ہے، دیکھنے والا بھی کہہ سکتا ہے، کہ یہ بہت ہی نفیس نمونہ تعمیر ہے۔

برنیئر و تاورنیئر (BERNIER & TAHERNIER) نے اس کو جا کر دیکھا تو میرے ساتھ ایک فرانسیسی سوداگر بھی تھا، اور میری طرح اس کی بھی یہی رائے تھی کہ یہ ایک ایسی

عمارت ہے کہ جس کی کامل طور پر تعریف نہیں ہو سکتی، مگر میں کچھ نہیں کہتا کیونکہ مجھے خوف تھا کہ شاید ہندوستان میں مدت سے رہنے کے سبب میرا مذاق بگڑ گیا ہو، لیکن میرا رفیق جو نووارد تھا اس نے یہ کہا کہ تمام فرنگستان میں ایسا حیرت افزا اور عسزم و شان کا مکان مین نے کوئی نہیں دیکھا۔

وہ موسیٰ دی لاما تھی نے وار سے وزیر فرانس کو مخاطب کر کے لکھا ہے کہ ”یہ عمارت ایک خاص اور نرالی ہی وضع رکھتی ہے لیکن تاہم دلچسپی سے خالی نہیں۔ اور میری رائے میں بالضرورت اس قابل ہے کہ ہماری فن تعمیر کی کتابوں میں جگہ پائے، اور اس کا تصفیہ میں آپ پر چھوڑتا ہوں، لیکن میں جو یہ کہہ رہا ہوں کہ یہ مقبرہ ایک حیرت افزا عمارت ہے کیا یہ سچ نہیں ہے، میں یقینی طور پر یہ کہتا ہوں کہ یہ مکان اہرام مصر کی نسبت جو ان گھڑ پتھروں کے ڈھیر ہیں، اور باہر کی طرف سے بحر اس کے کہ زمین کی طرح نیچے اوپر رکھ کر پتھروں کا ڈھیر لگا دیا گیا ہے کچھ نہیں ہے، اور جن کی اندرونی ساخت بھی بالکل معمولی ہے، جس سے انسان کی کچھ ہنرمندی اور ایجاد ثابت ہو، دنیا کے عجائبات میں شمار کئے جانے کا زیادہ تر مستحق ہے،

### نتیجہ

متذکرہ بالا بیانات سے میں نے دو امور پر زور دیا ہے، یعنی نہ تو کسی یورپین کا تعمیر تاج مین دخل ہے، اور نہ اس میں غیر اسلامی عنصر شامل ہے، یہ نتیجہ مختصر آجوبات ذیل پر مبنی ہے۔

(۱) شاہجہان بذات خود بہت بڑا ماہر فن تعمیر تھا،

(۲) یہ روضہ میر عبد الکریم اور مکرمت خان شیرازی وغیرہ کے زیر اہتمام تعمیر ہوا، جو ماہر فن تھے،

(۳) علی مردان خان اور آصف خان جن کو قرب شاہجہانی حاصل تھا بہت بڑے طراحان فن تھے،

(۴) ان سب ماہروں کے کارنامے ہندوستان میں ملتے ہیں، جو بالکل طرز فن مین متمیز



اسلامی ایرانی ہیں،

(۵) میں نے دیگر محققین کی آرا کو بھی آپ کے سامنے پیش کر دیا ہے جو بالکل متفق ہیں کہ کسی یورپین کا وجود دورانِ تعمیر تاج میں یہاں نہیں تھا،

(۶) میں نے داخلی اور خارجی دلائل سے بھی بحث کر دی ہے،

(۷) سب سے بڑے کرطرِ تعمیر کا تقابل بھی پیش کر دیا ہے،

غرضیکہ ان سب امور کو مد نظر رکھ کر میرا خیال ہے کہ تاج ایک مسلمان کا طے سرح شدہ ہے جس کے دل میں ہوتا تھا اور مرنے والی یگم کی محبت تھی، اور اسی کو سزاوار تھا کہ وہ مرحوم کے روضہ کی طرح ڈالتا،

## مصنفین کی نئی کٹاف سیرالہجابہ کے حصہ مہاجرین کی تیسری جلد

ارشاہ معین الدین احمد ندوی رفیق دارالمصنفین

جس میں حضرت عبداللہ بن عمر حضرت ابو ہریرہ دوسی، حضرت سلمان فارسی، حضرت ابوذر غفاری، حضرت خالد بن ولید، اور حضرت عمر بن العاص رضوان اللہ علیہم اجمعین، اور دیگر ۱۰۱ مہاجر صحابہ کے حالات و سوانح، اخلاق و فضائل، اور ان کے مذہبی، علمی، سیاسی، مجاہدات اور کارناموں کی تفصیل ہے، حجم ۴۳ صفحات، قیمت ۳۰/-

## حلفاء راشدین

سیرالہماجریں کا حصہ اول

یہ چاروں خلفاء کے ذاتی حالات و فضائل اور مذہبی و سیاسی کارناموں اور فتوحات کا آئینہ ہے، حجم ۵۵ صفحات، قیمت ۳۰/-

”منیجر“

## ”کتاب تحقیق و تحقیق“

از مولوی اقبال احمد صاحب سہیل ایم اے ایل ایل بی ایڈووکیٹ انعام گڈہ،

(۳۳)

پانچویں صورت افتد و استفادہ کی ہے کہ مقدم کے ایک خیال کی مدد سے کوئی دوسرا جداگانہ خیال اس سے منفر یا متضاد یا مماثل پیدا کیا جائے، مثلاً غالب کا شعر ہے :-

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لون

ہراک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو مین

اس شعر کو پیش نظر رکھ کر حضرت فانی نے ایک دوسرا لطیف تراویہ بالکل منفر خیال پیدا کیا ہے،

وہ پائے شوق دے کہ جہت آشنا نہ ہو

پوچھوں نہ خضر سے بھی کہ جاؤں کدھر کو مین

مثلاً حسب ذیل اشعار :-

امرا القیس مکر مقبر مقبل مدبر معاً

تجلی دمنح خطہ السیل من عدل

سہیل اگر چلنا تو نقش پا بھی لغزش سے مٹا دینا

نہیں زیا کسی کو کہو سے جانان کا پتہ دینا

(دعویٰ) ملیان نازبیں کہ بگر گوشہ خلیل خود زیر تیغ رفت و شہیدش نمی کنند



اسے سوزِ نامک کہاں جائے اب خلیل

(اسیل) اُنکدہ کو بھی تو گلستانِ بنا دیا

یہ بات ہر کس و ناکس کے بس کی نہیں ہے، بلکہ صرف چند بالکالوں کے لیے مخصوص ہے اور وہ بھی مدت کی مشق و ممارست کے بعد حاصل ہوتی ہے، غالب کے ہاں اسکی مثالیں بکثرت ہیں اور یہی غالب کا بڑا کارنامہ ہے،

مثلاً عشاقِ ہوس پیشہ کا خیال ہے کہ برسات کی کالی کالی راتیں بے مئے و معشوق بسر کرنا قیامت ہے، غالب بھی برسات کی اندھیری راتیں گزارنا دشوار سمجھتا ہے، مگر اسکی وجہ اور بتاتا ہے۔

کس طرح کانٹے کوئی شبِ ہمارے بزرگال ہے نظرِ خودِ اخترِ شماری ہائے ہمارے

پتھر بھی قابلِ توجہ ہے کہ ہلکا مصرعہ شکرِ سامع کے ذہن میں وہی قدیم خیال پیدا ہوتا ہے، لیکن جب دوسرے مصرعہ میں غیر متوقع طور پر ایک نئی اور اچھوتی بات معلوم ہوتی ہے تو روح کو غیر معمولی سرور حاصل ہوتا ہے، یہی اندازِ بلاغت ہے جو حسبِ ذیل اشعار میں ملحوظ رکھا گیا ہے،

عشقی اگر غمِ داد و جانِ دولِ سببِ شکر کن

(عرفی)

بیخِ اول بود و آشوبِ خیزداری بنود

پہلے مصرعہ سے جو خیالِ ذہن میں قبا ہوتا ہے وہ یہ کہ عشق کو اس گرانِ فروشی کے لیے الزام نہ دینا چاہیے، مگر دوسرا مصرعہ اس سے بالکل مخالف خیال یعنی الزامِ ارزانِ فروشی کی توجیہ کرتا ہے، بعض جگہ ذومعنیین استفہام سے بلاغت پیدا کی جاتی ہے مثلاً بابا فتانی فرماتے ہیں،

ای کہ می گوئی چرا جائے بجانے می خری این سخن با ساقی ماگو کہ ارزان کردہ است

(عاشقی) یاری پر سید شہلی را کہ چون برباد رفت مشقِ خاک کے وہ ہوا پیش پریشان کردہ ام

چون کے معنی (کس وجہ سے) اور (کس طرح سے) دونوں ہوتے ہیں، یہاں محبوب تجاہلِ عارفانہ کے

انذار میں عاشق کی بربادی کا سبب پوچھتا ہے اور سامع چونکہ سببِ بربادی کو بدی سمجھتا ہے اس لیے استفہام کے دوسرے معنی میں جواب دیتا ہے، اور بربادی عاشق کی تصویر کھینچ کر رکھ دیتا ہے۔

تمام عشاق کو کوچہ یار میں دفن ہونا چاہئے کسی قدیم شاعر کا شعر ہے۔

دفن کرنا بھلکو کوئے یار میں قبرِ بیل کی بنے گلزار میں

مگر غالب نکتہِ سخن جو دبائے عام میں مرنا بھی نہیں چاہتا تھا، اس پامال خیال سے اپنی ایک الگ شاہراہ نکال کر اپنی گلی میں دفن نہ کر مجھ کو بعدِ قتل

میرے پتہ سے غیر کو کیوں تیرا گھر ملے

یہاں ایک لطیف نکتہ یہ بھی ہے کہ معشوق کے حن سے زیادہ شہیدِ محبت کا واقعہ شہادتِ اہمیت اختیار کر لیا اور کوچہ یار مشہدِ عاشق کی حیثیت سے شہرت پذیر ہو گا نہ بہ حیثیتِ مسکنِ محبوب،

اتنا سب کتے ہیں کہ غمِ عشق میں انسان کو ہنسی نہیں آتی مگر غالب ایک قدم اور آگے بڑھتا ہے اور

یہ کہتا ہے کہ میں وہ ازلی غمِ نصیب ہوں کہ عشق سے پیشتر بھی جو ہنسی آتی تھی وہ حقیقتہً ہنسی نہ تھی زہرِ خند تھی اور دل کی دارِ فنگی کا ماتم،

پہلے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی اب کسی بات پر نہیں آتی،

حضرت خواجہ شیراز معشوق کی ایک خال سیاہ پر سمرقند و بخارا شمار کر دیتے ہیں، مگر غالب نکتہٴ شہس

باتا ہے کہ عاشق بے سرو سامان کے ذہن میں سمرقند و بخارا کا خیال آنا اصولِ نفسیات کے خلاف ہے، اور

سے بڑا اہتمام جس کی غالب کو حسرت ہی رہی یہ تھا کہ محبوب کی تشریف آوری کے وقت کہیں سے ایک بڑا

ہے خبر گرم اُن کے آنے کی آج ہی گھر میں یوریا نہ ہوا

دوسرے شعر اہلاکِ گوارا کرتے کہ محبوب کو کوچہ رقیب کا راستہ بتائیں مگر حضرت غالب یہ بھی کرتے

ہیں اور بہ وجہ محقول کرتے ہیں،



دعہ الوجود کا خیال ایک پامال خیال ہے، اور سب نے لکھا ہے، لیکن غالب کے ایک شعر کی مثال  
دنیا سے ادب میں نزل سیلگی،

نہ تھا جب کچھ خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا      ڈبو یا بھٹکے ہونے نے نہ تو یامین تو کیا ہوتا  
"فلسفہ" "منطق" "تصوف" اور شاعری کا اس درجہ دلکش اجتماع شاید کمین نہ نظر آ سکے۔

اشک محبت یا قطرہ نے کو موتیوں پر سب ترچہ دیتے ہیں، کسی استاد کا شعر ہے،

تا کہ راسخ اب کن اسے ابر نیان در بہا      قطرہ تلے ہی تو اند شد چرا گو ہر شود

توفیق بہ اندازہ ہمت ہے ازل سے      آنکھوں میں وہ قطرہ ہے جو گور نہ ہوا تھا

ہوس پیشہ عشاق عموماً حسن میں جذبہ خود نمائی کو پسند کرتے ہیں اور جتنا ہی ادھر سے ناز و عشوہ کی بارش

ہو اور فریب دلبری کی کوشش کی جائے اس قدر یہ دلفردشی پر آمادہ ہوتے ہیں مگر غالب، بلند نظر غالب، فطرت

انسانی کا راز دان، اور فلسفہ عشق کا نکتہ شناس ہے، وہ خود اپنے قصہ و ارادہ سے گرفتار ہونے کے ٹوٹا ہوا ہے

اور ایک حسن بے پروا اور نگاہ غلط انداز پر شہید ہو جانے کے لیے آمادہ مگر جہاں کسی نے اس کو گرفتار کرنے کے

لیے کمند بھیک اور قتل کرنے کے لیے تلوار اٹھائی وہیں اسکی فطرت خود پسند نے ابا کی، یہی وجہ ہے کہ جلوہ

سر بازار خواہ کننا ہی دلفریب کیوں نہ ہو بلند فطرت طبائع کے لیے کوئی سامان کشش نہیں رکھتا، غالب نے

ایسی بات کو ڈھونڈ لیا ہے، اور ہر جگہ جدا گانہ رنگ میں کہا ہے :-

سادگی پر اُس کے مرجانی حیرت دل میں ہو      بس نہیں چلتا کہ پھر خیر گفت قاتل میں ہو

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اسے خدا      لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

نظیری کا ایک ہمنام شعر ہے :-

مرا بہ سادہ دلیہائے من تو ان بخشید

خطا نمودہ ام و چشم آفرین دارم

جادہ شناس کوئے غیر بودم و دوست راہ جوئے

منکر ذوقِ ہمراہی خردہ بہ رہبری گرفت

رتیب کی خطا پر غالب کی سرزنش کیجاتی ہے، دوسرا ہوتا تو خفا ہوتا مگر غالب خوش ہوتے اور اتنا  
خوش ہوتے ہیں کہ اس جوشِ مسرت کو ایک متاعِ عزیز کی طرح نکال دیتا ہے چھپانے کی کوشش کرتے ہیں کہ  
شکرہ کو شگرت کی شکل میں پیش کرتے ہیں مگر مسرت ہے کہ نالہ فریاد سے بھی نعمتِ نشاط بنکر نکل رہی ہے، ملاحظہ ہو

اعتبارِ عشق کی خانہ خرابی دیکھنا      غرنے کی آہ لیکن وہ خفا چھ پر ہوا

اسلاف یہ کہتے آئے تھے کہ معشوق اسے ظالم، اتنے سمکار اور اتنے شقی القلب ہوتے ہیں کہ نالہ

مظلوم ہی کو نعمتِ محفل سمجھتے ہیں، غالب بھی یہی کہتا ہے مگر وہ آدابِ محبت کا راز دان ہے، کوئی ایسی بات جس کے

معشوق کی نقیص ہو اسکی زبان سے نکل نہیں سکتی، لہذا اداسے خیال کے لیے ایسا پیرایہ بیان اختیار کیا ہے

کہ عیب کو ہنر بنا دیا ہے

دور چشم بدبیری بزمِ طرب کے واہ وا      نغمہ بن جاتا ہے گر نالہ مراد ان جاگے،

گویا یہ معشوق کی سنگدلی نہیں ہے بلکہ اس بزمِ نشاط کی فضا ہی ایسی روح پرور ہے کہ غم، سرور سے

نالہ و نغمہ سے بدل جاتا ہے،

دنیا نالہ عشق کو شکوہ جفا سمجھتی ہے اور غالب اسکو تقاضائے تم قرار دیتے ہیں،

نالہ جز حسن طلب استم ایجا د نہیں      ہے تقاضائے جفا شکوہ بیدا و نہیں

یہاں ایک نکتہ اور بھی قابلِ توجہ ہے، بیدار گروں کی فطرت یہ ہے کہ تم بھی کرتے ہیں مگر فریادِ بستم

سے خفا بھی ہوتے ہیں یہاں تک کہ مظلوموں کا منہ جبراً بند کرنے کے خیال سے ہر فریاد پر جو جدید کی بارش

کرتے ہیں، ایسے ظالموں سے شکوہ بیدار حقیقتاً بجا و ستم کی تحریک ہے کیا حالات حاضرہ پر غالب کا یہ الہام

شعری بالکل منطبق نہیں ہوتا،



غالب نے پورا شعر نظیری کا دن دھاڑے اڑالیا اور چوری سے بھی نہیں بلکہ سینہ زوری سے اور کہا  
یہ ہے کہ اس طرح اپنی ملکیت بنایا کہ اگر نظیری زندہ ہوتا تو اسکو اپنا مال بجانے میں شہہ ہوتا اور اس لیرا  
قرائی کے صلہ میں اپنا دیوان شاد کر دیتا۔

جواب خواجہ نظیری نوشتہ ام غالب

خطا نمودہ ام و چشم انسرین دارم

تقدیر و تدبیر کی جنگ سلف سے چلی آتی ہے ایک فریق اگر تقدیر کا قائل ہے تو دوسرا تدبیر کا قائل  
دونوں میں صلح کر دیتا ہے اور اسی صلح کہ دونوں کی بات رہ جاتی ہے۔

ہرچہ فلک نخواست است بچکس از فلک نخواست

ظرف فقیہ سے نہ جست بادہ ماگزک نخواست

مطلب یہ ہے کہ بیشک تدبیری سے سب کچھ ہوتا ہے مگر خود تدبیر کا بنانا بھی تو تقدیر یعنی

قدرتی حرکات و ساقول کے اثرات پر مبنی ہے۔

یہ امر مسلمات شاعری میں ہے کہ عشاق کی آہیں بے اثر نالے نار سا اور دعائیں نامقبول ہوتی

ہیں غالب اپنی دعا ہائے پیچم کے غیر مستجاب ہونے پر عاجز آکر ایسی صورت نکالنا چاہتا ہے کہ معاذ اللہ

کارکنان قضاء و قدر کو بھی شکست ہو جائے اور ایسی دعا کرے کہ خدا سے بھی مسترد کرتے بن نہ پڑے

بتائے ایسی دعا کیا ہو سکتی ہے، لیجئے حضرت غالب کی زبان سے سنئے۔

حریف مطلب مشکل نہیں قصون نیاز

دعا قبول ہو یا رب کہ عمر خضر دراز

ملک اشعر کلیم کا ایک تمثیل شعر ہے۔

کے بہرناخوت چاک جگر خواہم نمود منکہ زخمش را نہان از چشم سوزن دایم

غالب نے اس شعر کے ہر مصرعہ سے ایک جداگانہ خیال پیدا کیا اور دوا لے الہامی شعر لکھ دیے جو اردو زبان میں پیش  
ہے مثل رہیں گے۔

نظر لگے نہ کہیں اُس کے دست و بازو کو

یہ لوگ کیوں میرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں

یہ وہی زخم جگر کو دکھانے کی مخالفت ہے مگر یہاں دنیا ہی دوسری ہے،

دوسرا شعر ملاحظہ ہو۔

زخم سلوانے پہ بھیر چارہ جوئی کا ہلطن غیر سمجھا ہے کہ لذت زخم سوزن میں نہیں

اس شعر کا خیال شعر کلیم کے دوسرے مصرعہ سے ماخوذ ہے مگر بالکل مخالف اور اچھوتا خیال بانڈھا ہے جو

کلیم کی تخیل سے براہ عمل نازک تر ہے،

میتلی کا شعر ہے،

بیم از وفا مدار بدہ وعدہ کہ من

از ذوق وعدہ تو یہ فردا نمی رسم

اسی کے لگ بھگ اور میرے خیال ناقص میں اسی سے ماخوذ مگر بد بھالندہ غالب کا حسب ذیل مشہور شعر

تیرے وعدے پر مجھے ہم تو یہ جان جھوٹ جاتا

کہ خوشی سے مرنا جاتے اگر اعتبار ہوتا

آرگس نے اسکو سرفات غالب کی مثال میں پیش کیا ہے اور یہ فرمایا ہے کہ دونوں خیال بجنسہ ایک ہیں

میتلی کے ”ہاں قبل وعدہ ہے اور یہاں بعد وعدہ“

حیرت ہے کہ حضرت بخود بھی اس کے متعلق یہ فرماتے ہیں ”میری رائے میں حضرت آرگس کا خیال صحیح

ہے نہ میں عرض کروں گا کہ حضرت بخود نے آرگس سے ایک جگہ اتفاق بھی کیا تو غلط کیا سوہ اتفاق کی مثال اسکا



بہتر ہو سکتی ہے۔ اولاً تو میں حضرت اگر کسی کا یہ فقرہ نہیں سمجھا (مگر مٹلی کے ہاں قبل وعدہ یہاں بعد وعدہ) مٹلی اپنے شعر میں معشوق سے التجا سے وعدہ کر رہا ہے اور ایسا وعدہ سے پہلے اپنے مر جانے کا یقین دلا کر وعدہ لینا چاہتا ہے، معلوم نہیں اس التجا کا کیا حشر ہوا، قیاس تو یہی ہوتا ہے کہ وعدہ نہ ہوا ہو گا بہر حال جب وعدہ ہوتے یا نہ ہونے کا کوئی پتہ شعر سے نہیں چلتا تو قبل وعدہ یا بعد وعدہ کیا؟ غالب معشوق کے فریب وعدہ میں مبتلا نہ ہونے پر اظہارِ فخر کر رہا ہے، یہ البتہ بعد وعدہ کا واقعہ ہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ بنائے خیال دونوں کے ہاں ایک مشور عام عقیدہ ہے کہ انسان انتہائے خوشی کا تحمل نہیں کر سکتا، مگر نتیجہ کے اعتبار سے دونوں شعرا بالکل مختلف ہیں، مٹلی کا شعر فطرت انسانی کے خلاف ہے، اور اسی کی اصلاح غالب نے اپنے شعر میں کی ہے، مٹلی کا معشوق سے یہ کہنا کہ تم وعدہ وصل کرو، تمہیں ایسا وعدہ کی زحمت نہ ہوگی اور میں وقت محمودہ کے بیشتر ہی محض وعدہ کی خوشی میں مر جاؤں گا، کیا صریح دھوکہ اور کھلا ہوا جھوٹ نہیں ہے؟ شادی مرگ صرف اس واقعہ مسرت پر ممکن ہے، جو بالکل غیر متوقع طور پر یکایک ظور پذیر ہوا اور جو حقیقتہً ناقابلِ برداشت خوشی کا موجب بھی ہو سکتا ہو، وعدہ معشوق تو خیال شعر کوئی بڑی اہم چیز نہیں ہے، یہ تو ہر وقت بہ آسانی کیا جاتا ہے اور اس سے زیادہ آسانی کے ساتھ توڑا جاتا ہے، اسکی خوشی کیا؟ جبکہ وفا کی امید ہی نہیں، ہاں ایسا وعدہ البتہ ایک غیر معمولی مسرت کا باعث ہو سکتا ہے، لیکن جو وعدہ ابتداء ہی سے بخیال عدم ایفا لیا جا رہا ہے اس پر خوشی کیونکر ہو سکتی ہے، اور خوشی نہیں تو شادی مرگ یعنی چوہ؟

برکس اس کے غالب کا شعر محض ایک شعر ہی نہیں بجائے خود ایک داستان ہے، عاشق صدمہ فراق محنت جان بلب ہے، اور محبوب کی خدمت میں عریضہ عشق بھیجتا ہے، کہ اب ہجر میں جینا دشوار ہے اگر آپ ایک خون ناحق کا گناہ اپنے سر لینا نہیں چاہتے تو خدا را میرا لینا آجائیے، یا اگر فوراً نہیں آسکتے تو کوئی نہ ہی متعین کر دیجئے، تاکہ اس وعدے کے سہارے انتظار کی کڑیاں جھیلی جاسکیں، معشوق اس خط کے جواب میں محض یہ نیت تسکین عاشق اور بلا خیال ایسا وعدہ ایک مدت معینہ کے بعد آنے کا وعدہ کر لیتا ہے،

اتفاق سے عاشق سخت جان وعدے تک زندہ رہتا ہے، پھر بھی محبوب و فائے ہمد نہیں کرتا، اب پھر یہ فریب خوردہ محبت معشوق کو اس کا وعدہ یاد دلاتا ہے، مگر وہاں یہ ارشاد ہوتا ہے، "آپ بھی اچھے خانے اچھے ہیں یہاں وفا سے وعدہ کا ارادہ ہی کب ٹھانید وعدہ تو جھوٹ موٹ محض اس لیے کرو یا تھا کہ تمہاری جان بچی رہے اور فرست شدہ امین ایک غیر ضروری اضافہ نہ ہو، عاشق ناشاد کے لیے یہ انداز جواب سخت و نفی ہوتا ہے اور جب وصال یار سے قطعی مایوسی ہو جاتی ہے تو یہ کوشش کرتا ہے کہ کم سے کم شہادتِ مسایہ سے تو محفوظ رہے اور اٹھاتھاق و اپنی کا الزام تو سر نہ پڑے، چنانچہ خیالت سے بچنے کے لیے فوراً جواب دیتا ہے، (تو یہاں کب آپ کے وعدوں پر اعتبار تھا، آپ یہ نہ سمجھیں کہ میں آپ کے وعدوں کو باور کر کے اب تک جیتا رہا ہوں قصہ اس کے بالکل برعکس ہے، اگر میں سچ سمجھتا ہوتا تو خوشی سے مر نہ گیا ہوتا،)

ممکن ہے کوئی معترض یہ کہے کہ داستان کا پہلا حصہ غالب کے الفاظ سے پیدا نہیں ہوتا اور یہ اس ناچیز کی جدت طرازی ہے مگر میں عرض کروں گا کہ قرینہ مقام خود اس مکالمہ حسن و عشق کے ابتدائی ٹکڑے کو ظاہر کر رہا ہے کہ آغاز گفتگو یوں ہوا ہو گا،

علاوہ برین "ترے وعدہ پر بچے ہم" کا فقرہ یہ بتاتا ہے کہ وعدہ کے سہارے جیتے رہنے کا واقعہ فریقین مکالمہ میں مسلم ہے اور اس فقرہ کا قائل پہلے جان بلب تھا، جینے کی توقع نہ تھی، مگر وعدہ کرنے والے نے اس مجبور جان بلب کی زندگی قائم رکھنے کے خیال سے وعدہ کر لیا تھا، اور اب زندہ رہ جانے پر طعن کر رہا ہے، ظاہر ہے کہ یہ طعن صرف اس بات پر ہو سکتا ہے کہ جھوٹے وعدہ کو سادہ لوحی سے سچ باور کیا، اور اسی الزام کی تردید عاشق ان الفاظ میں کرتا ہے "یہ جان جھوٹ جانا" یہ غالب کا کمال ہے کہ محض قرینہ مقام پر اکتفا نہ کر کے خود الفاظ شعر سے واقعہ کے محذوف ٹکڑے کی طرف ذہن سامع کی رہبری کر دیتی ہے صنعت اکثر اساتذہ نے برتی ہے، حضرت خواجہ حافظ علیہ الرحمہ کا مشہور شعر ہے،

بنفشہ طرہ مفقول خود گرہ می زد  
صباح کایت زلف تو در میان انداخت



اب بحالت زلف سننے کے بعد منقشہ کے غور و جن اور اہتمام آرایش پر کیا گزری، حافظہ خود کچھ اس کے متعلق نہیں فرماتے اور سانس کی تھلیل پر چھوڑ دیتے ہیں۔

خود حضرت غالب نے بھی ایک دوسرے شعر میں مذرت بیان کا یہی اسلوب اختیار کیا ہے اور وہاں کے کچھ اجزائے قابل و ابد صحت کر دیئے ہیں،

گدا بچھ کے وہ چپ تھامی ہو شامت اٹھا اور اٹھکے قدم میں پاسبان کے لیے

جناب تجھ کو نے یہ فرمایا ہے کہ غالب و سلی کے اشعار میں اتفاقیہ تو ارد ہو گیا ہے، میں یہ عرض کروں گا کہ تو ارد و موجب ہو کہ غالب کو شعر سلی کا علم نہ ہو، کون باد کر گیا کہ سلی کا اتنا مشہور شعر جس کو یاس و آسی، نیاز و آرگس سب جانتے ہوں اس سے غالب کے کان نا آشار ہے ہو گئے حتیٰ یہ ہے کہ شعر غالب اصلاح شعر سلی ہے، اور اتنی بہتر اصلاح ہے جس پر غالب کو بجا طور پر ناز ہو سکتا تھا،

اشعار غالب کے حل میں ایک مقام پر اور مجھ کو حضرت تجھ سے اختلاف ہے، وہ شعر یہ ہے،

قری کفت خاکستر و بلبل نفس رنگ اسے نالہ نشان جگر سوختہ کیا ہے

تجھ صاحب نے یہ تقلید شوکت میر تقی مرحوم اس شعر میں نفس رنگ کو نفسی رنگ پڑھا ہے اور

شعر کا مطلب یہ بیان کیا ہے (قری بھی نالہ کش ہے اور بلبل بھی، قری سوز عشق سے جل کر کفت خاکستر

ہے اور بلبل خاک سیاہ اور اس طرح دونوں اپنے سوز عشق کا موقع بنی ہوئی ہیں، ان کا دعویٰ عشق

مسلم ہے، اسے نالہ! میں اپنے سوز دل کے ثبوت میں دنیا کو کیا دکھاؤں، خالی نالہ دعویٰ بے دلیل اور

موجب دعوائی ہے)

میں یہ دعویٰ تو نہیں کرتا کہ مولانا تجھ کا بیان کردہ مطلب غلط ہے مگر اسکو کیا کروں کہ میرا

ذوق شعری اس مفہوم کو غالب کی طرف منسوب کرنے کے لیے کسی طرح تیار نہیں ہے، اس کے دو وجوہ ہیں

اولاً تو نفسی رنگ کا لفظ کا نون کو کھٹکتا ہے، یہ تو وہی قصہ ہوا جیسا کہ کسی شاعر صاحب نے حافظ

کے اس شعر میں

حافظائے خور و رندی کن خوش باش دلم تزدیر کن چون دگران قرآن را

دگران کو دگران پڑھا، اور پھر دگران نام کی ایک عجیب و غریب چڑیا ایجاد کی جس کے پروں پر کچھ

نقوش خط نسخ سے مشابہ ہوتے ہیں، اور دوسری چڑیاں ان نقوش کو آیات قرآنی سمجھ کر شاید قرأت

کے لیے ذکر کے پاس آتی ہیں اور دگر اس حیلہ سے ان خوش اعتقادوں کو چپٹ کر جاتی ہے، علاوہ

برین قفسی رنگ سے رنگ سیاہ ہی کیون مراد لیا جائے، کیا قفس کے لیے ضروری ہے کہ وہ کابھی نہ

اکثرہ تجربے بانس یا پتیل کی تیلیوں کے بھی تو ہوتے ہیں، جناب تجھ کا استدلال جو کتابت دیوان پر ہے

وہ چندان قابل اعتنا نہیں ہے، خود یہی مجموعہ مقالات تجھ و صاحب کے اہتمام میں شائع ہوا ہے، مگر کتابت

کی غلطیاں ایسی کثرت سے ہیں کہ الامان، وجہ ثانی اختلاف کی یہ ہے کہ اگر تجھ و صاحب کی تفسیر صحیح

مان لیا جائے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ غالب اپنے مرتبہ عشق کو بلبل و قری کے عشق سے فروتر سمجھتا ہے

اور یہ امر غالب کی فطرت کے بالکل مخالف ہے۔

میری نظر سے غالب کی جتنی شعر میں گزری ہیں کسی میں بھی اس شعر کی صحیح تفسیر نہیں کی گئی، مگر

جناب حسرت موہانی نے تو اسے نالہ کو جز نالہ بنایا، پھر بھی مفہوم شعر ویسا ہی لائیل رہا، غالب مرحوم

کو کیا خبر تھی کہ مقبول عوام ہونے کی مصیبت جس سے وہ جیسے جی ہمیشہ پناہ مانگتے، اور دامن بچاتے

رہے، مرنے کے بعد ان کے سر پر سے گئی اور نوبت یہاں تک پہنچ جائے گی کہ ذوق سخن کی بنا پر نہیں بلکہ

محض تجارتی اغراض سے دیوان غالب کے رنگا رنگ ایڈیشن شائع کئے جائیں گے اور عجیب و غریب

لکھی جائیں گی جن کو دیکھ کر اگر غالب زندہ ہوتے تو سر بیٹ لیتے،

ان شعر جن کو دیکھ کر مدت سے یہ خیال رہ رہ کے دل میں چٹکیاں لیتا تھا کہ جب ہر سطح کے

انتخاص شاعر غالب کی حیثیت سے جلوہ گر ہو رہے ہیں تو یہ ناجیز بھی کیوں نہ ہو لگا کر شہید دن میں



شامل ہو جائے، مگر مکر وہاں زمانہ نے کبھی اتنی فرصت نہ دی کہ ارادہ عمل کی صورت اختیار کرتا اور  
اتوار کی ضرورت بھی نہیں معلوم ہوتی کیونکہ جناب تجوّد کے جو مضامین اب تک طبع ہو چکے ہیں ان میں  
غائب کے اکثر مشکل اشعار کا صحیح حل کر دیا گیا ہے، خدا کرے جناب محدّوح کی موجودہ شرح دیوان  
غالب جلد نظر فروز ہو اور پرستاران غائب کے ذمے سے یہ فرض کفائی ساقط ہو جائے بہر حال یہ  
توجہ معترضہ تھا، جہاں تک مذکورہ بالا شعر کے شرح کا تعلق ہے یہ نیاز مند جناب تجوّد کا ہمنوا نہیں ہے،  
اسی لیے اپنی فہم ناقص اور ذہن نارسا کے مطابق جو مفہوم اس شعر کا سمجھ میں آتا ہے وہ نذر ناظرین ہے  
پہلے چند مقامات ذہن نشین کر لینا ضروری ہیں،

۱۔ قفس رنگ کے وہی معنی ہیں جو جناب نظم طباطبائی نے لکھے ہیں یعنی سب رنگ ان معنوں میں یہ لفظ  
زبان فارسی میں مستعمل ہے اور وجہ ظاہر ہے، رنگ کو اڑنے کی بنا پر طائر سے تشبیہ دیتے ہیں، یہاں بلبل کی  
مراد سے قفس رنگ کا لفظ سب رنگ سے زیادہ مناسب ہے،

۲۔ نالہ کشی ایک صفت مشترک ہے جو بلبل، قمری، اور عاشق ناشاد سب میں پائی جاتی ہے،

۳۔ نالہ کشی اگر حقیقی ہو تو فطری ظہور ہے دل کی اندرونی کاوشوں کا اور یہ کاوشیں ایک شاعر کے خیال  
میں صرف سوز و محبت سے پیدا ہوتی ہیں،

۴۔ سوز و محبت ہے افسردگی اور سر دہشی کا، خاکستروہ ہے حسین ایک چنگاری بھی نہ رہ جائے اور سوز کا نشا  
تک نہ پایا جائے۔

۵۔ سوز و محبت ہے رنگینی کا کیونکہ رنگینی علامت عیش و نشاط ہے اور سوز و محبت نام ہر حزن و اضطراب کا،  
اب شعر کا مطلب سنئے، (یوں ظاہری طور پر تو بلبل و قمری کی صدا میں بھی نالہ عاشق سے ملتی جاتی ہیں  
مگر نالہ عاشق اور نواسے بلبل و قمری میں اصل و نقل کا فرق ہے، عاشق کے نالے تو سوز و محبت کی بیانی ظاہر  
کرتے ہیں، یہ بات فنان بلبل و قمری میں کہاں قمری محض راگہ کا ڈھیر ہے حسین سوز و محبت کی کوئی چنگاری

نہیں ہے، اور بلبل ہر تن رنگینی نشاط ہے اسکو سوز و محبت سے کیا سروکار؟ ان دونوں کی صورتیں خود اس  
امر کی شاہد ہیں کہ یہ ذوق چنگو سونگلی سے محروم ہیں اور انکی نالہ کشی محض نقالی ہے، یہاں اسے نالہ سے مراد  
"اسے نالہ بلبل و قمری" ہے خود اپنا نالہ ہی طلب نہیں ہے، اس شعر کا مطلب سمجھنے میں شاعرین نے جو غلطی کی ہے  
اسکا سبب یہ ہے کہ لفظ خاکستری سے ذہن خاکستری علت یعنی آگ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اور یہ سب حضرات  
آغاز ہی یہاں سے کرتے ہیں کہ قمری جگر راگہ کا ڈھیر ہو گئی ہے، حالانکہ نہ تو مشبہہ اور مشبہ بہ میں پوری تاریکی  
ضروری ہے نہ معلول میں علت کا وجود پایا جانا ہمیشہ لازمی ہے، اسے دن سیلابوں سے مکانات منہدم ہوتے  
رہتے ہیں مگر کیا ہمیشہ گھنڈر میں پانی کا موجود رہنا ضروری ہوتا ہے، یہاں شاعر نے خاکستری رنگ کی بنا پر  
قمری کو کعب خاکستری کہا اور چونکہ خاکستری سوز سے بالکل خالی ہوتی ہے اس لیے قمری کو سوز و محبت سے محروم سمجھنے کے  
لیے شاعرانہ استدلال پیدا ہو گیا، برعکس اس کے شاعرین نے خاکستری موجودہ حالت سے قطع نظر کر کے  
اس کی سابقہ حالت کو وجہ شبہ قرار دیا اور قمری کے خاکستری رنگ کو دلیل سوز و محبت سمجھا جب اس طرح  
شعر کے ابتدائی حکمرے کا مفہوم ہی منشائے شاعر کے خلاف بدل دیا گیا تو معنی کی چول کیونکر مٹھے مجبوراً کسی  
نے قفسی رنگ ایجاد کیا، کسی نے اسے نالہ کو جز نالہ بنایا پھر بھی مفہوم شعر چستان کا جیستان ہی بار بار اچھ ہے  
خشتِ اول چون ہند منما ر کج تاثر یا می رود دیوار کج

میں نے اس مجموعہ مقالات کو من اولہ الی آخرہ معاذ اللہ نظر سے دیکھا اور یہ کوشش کی کہ کہیں کوئی  
وجہ اختلاف نظر آئے تو اس کو ظاہر کر دوں، تاکہ دیانتِ نقد کا حق ادا ہو جائے، اور میرا ضمیر جھکے  
بیجا پاسداری کا مجرم نہ ٹھہرائے لیکن یا تو میری نگاہ اتنی نکتہ رس نہیں، یا خود یہ مضامین اتنے بلند معیار کا  
ہیں کہ وہ صفحات کی ضخامت میں بجز چند مذکورہ بالا مقامات کے کوئی ایسی قابل ذکر فرد گزشت نہیں ملی جس سے  
اختلاف ضروری معلوم ہوا، اور جن مقامات پر میں نے اختلاف رائے بھی کیا ہے انکی نسبت بھی میرا یہ دعویٰ  
نہیں ہے کہ میری ہی رائے صحیح ہے مگر بہر حال اظہار ضروری تھا مجھے افسوس ہے کہ یہ تبصرہ غیر معمولی طویل



طویل ہو گیا، اور قید کے علاوہ صفت حرائق البدلت و اختلافات اور سرور استفادہ کی بحث کا مکمل غیر ضروری حد تک پھیل گیا، مگر چونکہ یہ ناچیز تصنیف و تالیف کا نوگرا و مضبوط خیالات کا عادی نہیں ہے، اس لیے مجبوراً جو خیال جس ترتیب سے دماغ میں آتا گیا، قلمبند کر دیا گیا، نظر ثانی اور حک و اصلاح کی نوبت نہ آئی، ان حالات میں امید ہے کہ ناظرین چشم پوشی فرمائیں گے۔

ان یہ گذارش کر دینا ضروری ہے کہ مضامین زیر نظر کی طباعت جہاں تک حسن خط اور کاغذ کی نفاست کا تعلق ہے بہت عمدہ ہوئی ہے، البتہ کتابت کی غلطیاں بکثرت ہیں، اور یہ ایک ناگزیر مصیبت ہے اور بعض افلاطون کتابت تو غالباً ارتقا چلی آتی ہیں، مثلاً خاقانی کے مژدہ جو ذیل شعر میں برکنم کے بجائے برکشم لکھ گیا ہے، غاراجو مار برکنم وانگہ از عصا صد چشمہ چون کلیم ز غار ابر ادرم فارسی میں کپڑے اتارنے کو جامہ کندن کہتے ہیں اسی لیے کپڑے بدلنے کا کمرہ جامہ کن کہلاتا ہے، یہ غلطی غالباً ابتدا میں مطبع نو لکھنوی نے کی جو اب تک چلی جاتی ہے اور نہ تو میں فاضل شارحین نے اس پر توجہ کی ہے نہ خود مولانا بخود نے کوئی خیال فرمایا،

کتاب کے آخر میں ایک غلط نامہ دیدیا گیا جس سے ایک بڑی حد تک تلافی ہو جاتی ہے، مجھے امید ہے کہ اردو عالم ادب سے دلچسپی رکھنے والے حضرات بالعموم اس کتاب کا خیر مقدم کریں گے،

## الہامی الاسلام

از مولوی ابوالحسن صاحب مودودی رفیق اعزازی دارالمصنفین

جسٹین اسلام کی حقیقت اور اسلام کے قوانین جنگ و صلح، ہر مضمین کے جوابات اور شکوک و شبہات کا ازالہ اسلامی قانون کا دور رس مذہب اور دوسری قوموں کے قوانین جنگ و صلح، ہر مضمین کے جوابات اور شکوک و شبہات کا ازالہ اسلامی قانون کی برتری، لکھائی چھپائی عمدہ کاغذ اعلیٰ صفی صحت ۲۹۲ صفحے قیمت للہ

نمبر

## تاریخ تہذیب و تمدن

### سیدی علی علی ہندوستان میں

ترکی امیر البحر سیدی علی گرام سے لوگ کم واقف ہیں، اس نے سفر نامہ کے طور پر محیط اور مرآۃ الممالک کے نام سے دو کتابیں لکھی ہیں، "محیط" اس بحاطہ سے نہایت قیمتی کتاب ہے کہ اس میں ان راستوں کا مفصل بیان ہے جو عرب جہاز رانوں نے قرون وسطیٰ کے پچھلے دور میں اختیار کئے تھے قبل اس کے کہ اہل پرگال نے ان مشرقی بحیرون کو عبور کر کے اپنے بیانات و نقشہ جات کے ذریعہ سے یورپ کو ان کے حالات سے مطلع کیا، "محیط" کے جن ابواب میں تفصیلی بیانات ہیں ان کا ترجمہ ڈاکٹر ایم، بٹنر (DR. M. BITTNER) نے جرمن زبان میں کیا ہے، سیدی علی کی دوسری کتاب مرآۃ الممالک سے لوگوں کو نسبت کم واقفیت ہو، اس کا ترجمہ ۱۸۹۵ء میں دان ڈیئر (VON DIEZ) نے جرمن میں کیا اور چند سال بعد ایم، ماس (M. MORIS) نے فرانسیسی زبان میں کیا، ۱۸۹۹ء میں وسط ایشیا کے مشہور سیاح آرمینس میمری (ARMIN) نے ایک تازہ انگریزی ترجمہ شائع کیا، کارخانہ وطن لاہور نے ایک زمانہ میں اس کا اردو ترجمہ بھی شائع کیا تھا، گو بہت غلط ہے۔

ہمیں سیدی علی کے متعلق جو کچھ واقفیت ہے وہ اسی غیر معمولی کتاب سے حاصل ہوئی ہے، جس میں اس نے خود اپنے حالات بیان کئے ہیں وہ سلطان سلیمان اول کے زمانہ میں تھا اور اس کی خدمات کا بیشتر حصہ اسی سلطان کی ملازمت میں گذرا، اس کے باپ کا نام حسین تھا، اس کا بیان ہے کہ فتح قسطنطنیہ کے بعد سے اس کا



باب اور واداشاہی اسلحہ خانہ غلط کے متمم تھے، اس نے خود بھی فن جہاز دانی کا عمیق مطالعہ کیا تھا، وہ منہج  
رہوڈس (RHODES) کے موقع پر موجود تھا اور ان تمام لڑائیوں میں شریک تھا جو بحر روم میں واقع  
ہوئیں، نیز خیر الدین پاشا کی تمام فتوحات میں اس کا ہر کام تھا، اس نے ہیئت فلسفہ اور فن جہاز دانی پر  
کئی کئی لکھین اور کتب رومی کے نام سے مشہور ہوا۔

۱۵۳۵ء میں بہادر شاہ سلطان گجرات شہنشاہ ہمایوں سے شکست کھا کر اہل پرتگال کی مدد حاصل  
کرنے کے لیے دیو (Diu) پہنچا اور اس مدد کے معاوضہ میں اہل پرتگال کو دیو (Diu) میں ایک  
قلعہ بنانے کی اجازت دی اور اس قلعہ کی تعمیر نہایت تیزی سے شروع ہو گئی، یہاں در شاہ نے سلطان ترکی کی خدمت  
میں بھی مدد کی درخواست بھیجی تھی لیکن قبل اس کے کہ ترکی بڑا بہادر شاہ کی مدد کو پہنچے اس کا مقابلہ پرتگالی  
یہڑے سے ہو گیا، اور سلیمان پاشا امیر البحر کو نومبر ۱۵۳۵ء میں دیو (Diu) سے واپس ہونا پڑا، چند سالوں  
کے بعد ۱۵۳۵ء میں ایک دوسرا ترکی بڑا مصری امیر البحر پیری بیگ کی سرکردگی میں سوئز سے روانہ ہوا اور  
قیس قندس میں پہنچ کر ہرمز (HORMUZ) کو جو پرتگالیوں کا مقبوضہ تھا تاراج کیا لیکن آخر اسے بھی پرتگالی  
یہڑے سے پسپا ہونا پڑا، پیری بیگ خود مصر پہنچ گیا لیکن اس کے جہازات کا بیشتر حصہ بصرہ میں رہ گیا، ان  
جہازات کو واپس لیجانے کی خدمت مراد بیگ کو سپرد ہوئی، لیکن وہ بھی ناکام رہا، آخر سلطان ترکی نے سیدی  
سیدی کو مصر کا امیر البحر مقرر کر کے اس یہڑے کو بصرہ سے واپس لیجانے پر مامور کیا،

سیدی علی صلب سے موصول ہوا تھا کہ بہادر شاہ اور وہاں سے کربلا کی زیارت کے لیے گیا، بغداد واپس آکر  
وہ قلعہ الامارہ کو روانہ ہوا اور واسط سے گذر کر زکیر گیا اور وہاں سے بصرہ پہنچا، یکم شعبان ۹۷۱ھ کو بصرہ سے  
مصر کی طرف جہاز سے روانہ ہوا، راستہ میں سقط کے قریب پرتگالی جہازوں سے مقابلہ ہوا جس میں پندرہ  
میں سے صرف نو ترکی جہاز محفوظ رہ سکے، اس کے بعد یہ مختصر ترکی بڑا ایک زبردست طوفان میں گرفتار ہو کر  
ہندوستان کے مغربی ساحل کی طرف بہہ نکلا، اس طوفان میں ان جہازوں کو بہت نقصان پہنچا، خود سیدی علی

کا بہادر بری طرح زخمی ہو گیا تھا، آخر بمبئی میں تمام یہ جہازیں جمع ہوئیں اور سلطان احمد  
اسے مدعو کیا تھا،

جس زمانہ میں سیدی علی گجرات پہنچا وہ اس ملک کیلئے نہایت انتشار اور ابتری کا زمانہ تھا، چند ہی روز  
قبل محمود ثانی قتل کیا جا چکا تھا اور اس کی جگہ احمد خان احمد شاہ ثانی کے لقب سے تخت پر بٹھا یا گیا تھا اور محض نام کا  
سلطان تھا اعلیٰ طبیب نے گجرات کے سیاسی حالات کو مختصر طور پر بیان کیا ہے اور اس سلسلہ میں سلطان محمود کے قتل  
اور ناصر الملک خداوند خان اور عادل خان کا ذکر کیا ہے جنھوں نے اس وقت کی سیاسی فضا میں نمایاں حصہ لیا  
یہ دیکھ کر کہ بحری راستہ سے مصر پہنچنا ناممکن ہو، سیدی علی نے بڑی راستہ سے سندھ، پنجاب اور افغانستان  
ہوتے ہوئے قسطنطنیہ پہنچنے کا فیصلہ کیا، آخر نومبر یا ابتدائے دسمبر ۱۵۳۵ء میں وہ اس لمبے سفر کے لیے روانہ  
ہوا اور بھرچ، بڑودہ، چپانیرا اور محمود آباد سے گذر رہا تھا اور احمد آباد پہنچا جو اس وقت بھی گجرات کا دار السلطنت تھا  
راستہ میں اسے تارک کے درخت نظر آئے اور اس نے تاڑی کو اتارتے ہوئے بھی دیکھا، یہ اس کے ساتھیوں کے  
لیے ایک عجیب چیز تھی، وہاں اُسے بڑے بڑے برگد کے درخت بھی دکھائی دیے جنکی جڑیں شاخوں سے  
لٹک رہی تھیں اور وہ اس قدر وسیع تھے کہ ان کے نیچے ہزاروں آدمی کھڑے ہو سکتے تھے، بعض مقامات  
پر خیمہ کے ہر چار طرف بے شمار بندر اور چھوٹے چھوٹے طوطے جمع ہو جاتے تھے، سورت سے روانہ ہونے کے  
تقریباً پچاس روز بعد غالباً جنوری ۱۵۳۶ء کے پچھلے حصہ میں سیدی علی احمد آباد پہنچا اور وہاں وزیر عماد الملک  
اور سلطان احمد ثانی سے ملاقات کی، سلطان بہت مہربانی سے پیش آیا اور ایک گھوڑا، کئی اونٹ اور سفر خرچ  
کے لیے روپیہ پیش کیا، سیدی علی کا بیان ہے کہ سلطان نے اُسے بحر روم کی گورنری بھی پیش کی تھی لیکن اس نے  
قبول نہیں کیا، عماد الملک کے مکان پر اتفاق سے ایک پرتگالی سفیر سے ملاقات ہو گئی، دونوں میں گفتگو  
نہایت تیزی سے ہوئی اور اس سفیر نے سیدی علی کو مدعی دی کہ تم کسی بندر گاہ سے نہ جاسکو گے جس کا جو اس سیدی علی  
نے یہ دیا کہ میں خشکی کی بھی سفر کر سکتا ہوں، احمد آباد کے قیام میں سیدی علی نے شیخ احمد غفرانی کے مزار کی زیارت کی



اور میں اس نے اپنی مشہور کتاب "میرا" کی تالیف بھی کی جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔

## اینسٹین کا عالمگیر مذہب

اینسٹین (EINSTEIN) کو لوگ دہری کہتے ہیں، لیکن یہ ممتاز سائنس دان اور فلسفی جس نے دنیا کے سامنے اپنا نظریۂ اضافیت پیش کیا ہے، درحقیقت دہری نہیں، البتہ اُس کا یہ عقیدہ نہیں ہے کہ خدا ایک عظیم انسانِ انسانی ہستی ہے اور نہ اُس کے نزدیک اس معنی میں گناہ کوئی چیز ہے جس معنی میں عام طور پر گناہ کو گناہ سمجھا جاتا ہے۔ اس کا ایک خاص نقطہ نظر ہے جو ان لوگوں میں بھی مشترک ہے جنہوں نے اسکی طرح کائنات کے مآخذ کو دریافت کرنے کی کوشش کی ہے اور جنکو ہمیشہ اس کو اصل راز سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ وہ اس نقطہ نظر کو "عالمگیر مذہبی حس" (COSMIC RELIGIOUS SENSE) کے نام سے پکارتا ہے۔

اینسٹین میں حد درجہ انسانیت ہے، وہ فطرت کو پسند کرتا ہے اور لوگوں کو خوش دیکھنا چاہتا ہے۔ اس کا قول ہے کہ سب سے زیادہ خوبصورت شے جو کہیں بھی پائی جاسکتی ہے ایک ایسا چہرہ ہے جس سے مسرت ہو سکتی ہو۔ خود اُس کا چہرہ دیکھنے والوں کے اوقات میں چمک اٹھتا ہے۔

اینسٹین فرقہ دارانہ سیاست میں شامل نہیں ہوتا، بجائے اس کے اُسے رفاه عام کے کاموں سے خاص طور پر دلچسپی ہے۔ دوستوں سے اکثر صلح و آشتی کے موضوع پر گفتگو کرتا ہے، اس کا خیال ہے کہ بین الاقوامی تعلقات کی مضبوطی سے جس کا اظہار علوم و فنون، ادبیات اور اقتصادیات میں ہو رہا ہو جنگ کا استحصال ہو جائے گا۔

نیویارک ٹائمز میگزین کے ایک مقالہ میں وہ مذہب کی ابتدا کو مختصر طور پر بیان کرتا ہے، "اسکا خیال ہے کہ مذہب انسان کے فطری مطالبوں کا جواب ہے، دنیا کے قدیم باشندوں میں "خوف کا مذہب" تھا، بھوک کا خوف، جنگی جانوروں کا خوف، بیماری اور موت کا خوف اور ان سب سے محفوظ رہنے کے لیے لوگ انسان کے مثل دیوتاؤں کے سامنے قربانیاں پیش کرتے تھے، اس کے بعد وہ مذہب

آیا جس کا سبب انسانوں کے اشتراک کی جذبات میں ہے، مثلاً جس کا سبب اُس رب کی ہدایت اور محبت کی توفیق میں پایا جاتا ہے جو حفاظت کرتا ہے، فیصلہ کرتا ہے، جزا اور سزا دیتا ہے، وہ کہتا ہے کہ یہی خدا کا اشتراک یا اہل تخیل ہے "عالمگیر مذہبی حس" کو وہ یوں بیان کرتا ہے،

"ہر زمانہ کے مذہبی پیشواؤں میں یہ عالمگیر مذہبی حس پایا جاتا تھا، جو نہ عقائد کو تسلیم کرتا اور نہ خدا کو انسانی شکل میں مانتا، لہذا کوئی مذہبی ادارہ ایسا نہیں ہو سکتا جس کے خاص خاص اصول عالمگیر مذہبی تجربہ پر مبنی ہوں، چنانچہ ہر زمانہ کے بے دینوں ہی میں ایسے لوگ ملتے ہیں جنکو یہ بلند ترین مذہبی تجربہ حاصل تھا، بیشیہ لوگ اپنے ہم عصروں کو دہریہ معلوم ہوتے تھے لیکن کبھی کبھی ولی بھی سمجھے جاتے تھے، اس نقطہ نظر سے اگر دیکھا جائے تو ڈیموکرٹس (DEMOCRITUS) فرانسیس آف آسانی (FRAN-

CISOFASSISI) اور اسپینوزا (SPINOZA) ایک دوسرے سے قریب معلوم ہوتے ہیں، اگر یہ عالمگیر مذہبی تجربہ خدا یا اصول مذہب کے صحیح تخیل کی جانب رہنمائی نہیں کر سکتا تو کیونکر ممکن ہے کہ ایک شخص سے دوسرے شخص کی طرف منتقل کیا جاسکے، مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ علم و فن کا سب سے زیادہ اہم فرض یہ ہے کہ ان لوگوں میں جو اس کی صلاحیت رکھتے ہیں اس جذبہ کو بیدار کر کے قائم رکھیں، اس طرح ہم سائنس اور مذہب کے تعلقات کی وضاحت کر سکتے ہیں جو مروجہ اسے بہت مختلف ہو گئی تاریخ کے مطالعہ سے مذہب اور سائنس ایک دوسرے کے حریف نظر آتے ہیں جنہیں اتفاق ہو ہی نہیں سکتا، اور اس کا سبب بھی واضح ہے، اس شخص کے لیے جو تمام واقعات میں قانون علت کا قائل ہے اور جو دل سے اس قانون کا معتقد ہے ایک ایسی ہستی کا تخیل جو دنیا کے واقعات کے تواتر میں دخل دیتی ہو قطعی ناممکن ہے، مذہب کے مذہب کا اور نہ اشتراک و اخلاقی مذہب کا کوئی اثر ایسے شخص پر ہو سکتا، ایسا خدا جو جزا و سزا دیتا ہے اُس کے خیال میں بھی نہیں آ سکتا اس لیے کہ انسان اپنی اندرونی اور بیرونی ضرورت کے مطابق کام کرتا ہے اور خدا کی نظر میں وہ اپنے کاموں کے لیے اسی قدر کم ذمہ دار ہے جس قدر ایک بچہ



شہابی حرکات کے لیے ہے۔

ایٹلیئن کے خیال میں سائنس پر اخلاق کی تخریب کا الزام غلط ہے، وہ کہتا ہے کہ "انسان کا اخلاقی برتاؤ تو زیادہ تر ہمدردی، تعلیم اور اشتراکی تعلقات پر مبنی ہے" اس کے لیے مذہب کی مدد کی ضرورت نہیں انسان کی حالت بہت افسوسناک ہوتی اگر اسکی صحیح روش کے لیے موت کے بعد کی سزا جزا کے خوف و توقع ہی کی ضرورت ہوتی، لہذا یہ بالکل قدرتی ہے کہ مذاہب نے ہمیشہ سائنس کی مخالفت کی ہے اور اس کے حامیوں کو سزا دی ہے، لیکن دوسری طرف میں یہ بھی کہتا ہوں کہ سائنس کی تحقیقات کے لیے عالمگیر مذہبی حس بحساب سے زیادہ قوی اور اعلیٰ محرک ہے، جو غفلت تحقیقات سائنس کے مفہم عملی حصہ کو جانتا ہے وہ ان لوگوں کی دماغی حالت کے سمجھنے میں غلطی کر سکتا ہے جنہوں نے ارباب شک کے ساتھ رہ کر بھی اپنے جیسے تمام دنیا پر زمانہ کے دماغ دانوں کی رہنمائی کی ہے، جن لوگوں نے اپنی زندگیوں اس قسم کے کاموں کے لیے وقف کر دی ہیں صرف انہیں کو اس جذبہ کا احساس ہو سکتا ہے جس نے ان لوگوں کو اپنے مقصد پر قائم رہنے کی قوت بخشی ہے۔ یہ عالمگیر مذہبی حس ہی جو جس نے اس قوت کو پیدا کیا جو ایک محصور نے صحیح کہا ہے کہ ہمارے مادیت کے زمانہ کے سچے مذہبی لوگ وہی ہیں جو تحقیقات میں سچے دل سے لگے ہوئے ہیں۔"

### سلطان صلاح الدین

اسلام اور مسلمانوں کے متعلق یورپ کے اہل قلم کا جو رویہ ابتدا سے چلا آتا ہے اس میں عملاً اب تک بہت کم فرق ہوا ہے، اس لیے عرصہ دراز کے بعد اگر نظر کسی ایسی تحریر پر پڑ جاتی ہے جو عام روش سے مختلف ہوتی ہو تو بے اختیار یہ سوال دل میں پیدا ہوتا ہے کہ "انجمنی بنیم بہ بیداریت یارب یا نجواب" چنانچہ اسی قسم کا ایک واقعہ تیس کی ایک قریبی اشاعت کے مطالعہ میں پیش آیا جو غالباً ناظرین کے لیے بھی ایک غیر معمولی چیز ہوگی۔

سٹرچارٹس روزن بالٹ (CHARLES ROSEBAUM) نے سلطان صلاح الدین کی سیرت لکھی ہے اور اس پر ہائیکس کے ادبی نمبر میں ایک تبصرہ ہوا ہے، ذیل میں اس کا خلاصہ ہے، کاش یورپ میں مصنفین سٹرچارٹس بالٹ

کی انصاف پسندی کی تقلید کرتے،

موجودہ معیار کی رو سے جنگ صلیبی کے عیسائیوں کی اخلاقی حالت مسلمانوں کے مقابلہ میں اکثر قابل شرم تھی اور اگر صلاح الدین کے ساتھ انصاف برتا جائے اور اسے مذہبی تعصب سے علیحدہ کر کے تاریخی روشنی میں دیکھا جائے تو وہ اپنے دشمنوں سے بہتر مبارزا اور بہتر انسان معلوم ہوتا ہے، ایسا شخص جس نے اکثر ان صفات کی قابل تعریف مثالیں پیش کی ہیں جو عام طور پر دین عیسوی کی طرف منسوب کی جاتی ہیں، اس کے عیسائی حریفوں نے تو بیشتر ان خوبیوں سے لاپرواہی برتی اور موجودہ زمانہ میں ان کی وہ خلائی کی عادت پر خاص طور سے توجہ ہوتی ہے، ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا تھا کہ اہم ملکی اسباب کی بنا پر کوئی شخص اپنا وعدہ توڑ ڈالتا بلکہ یہ رواج ہی تھا کہ معاہدہ سے پورا فائدہ اٹھانے کے بعد اسکی خلاف ورزی کرتے اور مذہبی پیشواؤں سے نیے دینوں کے ساتھ کیا ہوا معاہدہ توڑنے کی معافی حاصل کر لیتے آج یہ بات بے شرمی اور نا انصافی کی اور نہایت نامناسب معلوم ہوتی ہے اگرچہ اس میں شبہ نہیں کہ اس زمانہ میں اس کی اجازت تھی، بلکہ غالباً مالک عیسوی کے دشمنوں سے اس طرح پر فائدہ اٹھانا مستحب سمجھا جاتا تھا، مگر صلاح الدین غیر مسلموں کے ساتھ معاہدہ پر قائم رہا حالانکہ وہ اپنے مذہب اور اس زمانہ کے قانون کی رو سے معاہدہ کی خلاف ورزی کرنے والوں کے ساتھ سختی سے پیش آ سکتا تھا، اس نے ایسی رواداری کا اظہار کیا جس نے یورپ نا آشنا تھا اور ایسی انسانیت کا برتاؤ کیا جس سے عیسائی تقریباً ناواقف تھے، اپنے دشمنوں کیساتھ ایسی مراعات اور عالی ظرفی برتی جو اعلیٰ ترین ستائش کی مستحق ہے، صلاح الدین کے بیت المقدس فتح کرنے سے تقریباً نوے سال قبل عیسائیوں نے اس مقدس شہر کو فتح کیا تھا لیکن فتح کے وقت صلاح الدین نے اپنے دشمنوں کے ساتھ جو سلوک کیا اس کا مقابلہ جنگ صلیبی کے مبارزوں کے برتاؤ سے کرتے وقت عیسائیوں کو شرم آنی چاہیے، سلطان کی عنایتیں اور نوازشیں عام تھیں، اس کی خاکساری، انرم دلی اور ہر بانی صرف سائلوں، سو فیوں، شاعروں اور درویشوں تک محدود نہ تھی بلکہ اسکی وسعت بے یار و مددگار



جیسائیوں، خطرناک دشمنوں جنہیں قانون جنگ کے مطابق وہ قتل کر سکتا تھا یا بطور غلام کے فروخت کر سکتا تھا، اور فتنہ انگیز جو لیون تک تھی،

## روس اور سیکور

ہندوستان کے ممتاز فاضل ڈاکٹر سر راجندر ناتھ ٹیگور اچھل روس کی سیاحت میں مصروف تھے، یورپ کے روس کے جدید نظریات کی بنا پر جو عام سیراری ساری دنیا میں اسکے خلاف پھیلا دی ہو معلوم ہو کہ اسکے استقامت پر سیاسی بین، ہمیں اس سمجھت نہیں کہ موجودہ صورت حال یورپ کی راہ انانیت میں کس حد تک خلل انداز ہوگی، دیکھنا یہ ہے کہ تمدنی حیثیت سے یہ تحریک باشندگان روس کیلئے کتنا مفید ثابت ہوتی ہے، اس سلسلہ میں ڈاکٹر ٹیگور کا یہ بیان کی قدر دہی سے پڑھا جائیگا جو انھوں نے عینی مشاہدہ کی بنا پر حاصل کیا ہے۔

روس نے تو مجھے دکھایا میں ماسکو گیا اور دیکھا کہ جس قسم کی تعلیم روسی دہقانوں اور مزدوروں پر لگوں کو دی جاتی ہے اس کے خلاف دہقانوں میں کام کرنے کے قابل نہیں بن کر ملکہ تمدنی حیثیت سے بھی ترقی کر رہے ہیں، لیکن سادہ مزاج روسیوں کو نالچ گھر غائبانہ تھیٹر اور تمدنی زندگی کو وہ تمام مرکزوں میں جتن ہو کر دکھا گئے تھے، انھوں نے دس سالوں میں روس میں جتنی تبدیلی ہو چکی ہے وہ ہم ہندوستانیوں کے لیے ایک زبردست تجربہ ہے۔ میں نے جو ان کے زمانہ میں روس کے عوام کی سیر کی جا رہی ہے اور جس سے آج ہندوستان کے عوام میں ہندوستان میں ترقی پانچ فیصد لوگ ایسے ہیں جو کچھ پہلے تھے، یہ تعلیم انہیں محض کھنے پینے کے قابل دس سال قبل روس کی حالت بھی اس بہتر تھی لیکن اب یہ کچھ مجھ پر نہایت درجہ اثر ہو کر غریب سے غریب روسیوں میں بھی خوش خوردی کی ترویج جتنی تمدن کے عناصر اور حسن کا ذوق پایا جاتا ہے پہلے قومی اور مذہبی منافشات روس میں بھی عام تھیں جیسے کہ آجنگ ہندوستان میں عام ہیں مگر اب ان پر تمام اثرات ان ختم ہو چکے ہیں، یہودیوں، آرمینیوں، جیسائیوں اور مسلمانوں نے مبادلات کا سہن سیکھ لیا ہے، ہمیں شہد نہیں کہ روس کے ارباب محل عقد تعلیمی اداروں کی معاشیاتی اور سیاسی مسائل کی اصلاح کا کام لیتے ہیں لیکن ان خیالات سے مجھے کوئی تعلق نہیں، میں کسی کی معاشیاتی تعلیم پر اظہار رائے نہ کروں گا، اسلئے کہ اس مضمون سے مجھے شکر نہیں ہے مجھے تو اس طریق سے دلچسپی ہے جو روس نے عوام کو روشن خیال بنانے کے لیے استعمال کیا ہے، اہل روس قدیم مذہبی عقائد کے قابل نہیں ہیں، ان کا مذہب نوح انسان کی خدمت ہے۔

## انجیاء علیہ

### ۱۹۳۰ء کے نوبل انعامات پانچوالے

علم طبیعیات میں، ایم ڈیمر کے معارف میں ہندوستانی فاضل پروفیسر رامن کے نوبل پرائز حاصل کرنے کی مسرت بخش خبر سنا چکے ہیں، موصوف کلمتہ یونیورسٹی میں علم طبیعیات کے استاد ہیں، ۱۹۲۸ء کو پیدا ہوئے، مدراس یونیورسٹی سے اعلیٰ امتیاز کے ساتھ سند حاصل کی، پھر ہندوستانی سول سروس سے منسلک ہوئے، اور شعبہ مالیات کے ایک ممتاز عہدے پر فائز کئے گئے، اور اسی کے ساتھ اپنا علمی مشغلہ بھی جاری رکھا، اور ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں کی دعوت پر مدراس، لاہور، پٹنہ اور ناگپور وغیرہ میں آپ نے وسیع خطبے دیے، اسی کے ساتھ ہندوستان اور انگلستان کی مختلف علمی مجلسوں میں علم طبیعیات کے شعبہ کی صدارت تفویض ہوئی، پھر سول سروس سے سکدوش ہو کر مستقل طور پر کلمتہ یونیورسٹی سے وابستہ ہو گئے، جدید علم طبیعیات میں انکی چند اہم تصنیفات بھی ہیں، جن میں سے اہم ترین وہ تصنیف ہے جس میں انھوں نے علم طبیعیات میں اپنے ایک جدید ترین اکتشاف کی تشریح کی ہے، اور اسکو اپنے نام سے منسوب کرتے ہوئے "فنل رامن" سے موسوم کیا ہے، علم طبیعیات کے علماء و ماہرین نے موصوف کے اس جدید اکتشاف کا نہایت مسرت کے ساتھ خیر مقدم کیا، کہ اسکی بنیاد پر علم طبیعیات میں چند اہم مسائل کا اضافہ ہوا، اور اسی کے اعتراف میں موصوف کو یہ نوبل پرائز عطا ہوا ہے۔

علم طب میں، ۱۹۳۰ء میں علم طب کا نوبل پرائز امریکہ کے ایک فاضل ڈاکٹر کارل لازڈ شٹینز کو تفویض ہوا، موصوف ۱۹۲۸ء میں پیدا ہوئے، ۱۹۲۹ء سے اپنا علمی مشغلہ جاری کیا، اور اس وقت



نیویارک کے مشہور انسٹیٹیوشن راکفلر کے شعبہ طب کے رکن خاص ہیں، اسی طرح علم ادب کا نوبل پرائز امریکہ کے ایک مشہور فنانس نوٹس منکر لوٹز کو دیا گیا ہے یہ اس وقت امریکہ کے فنانس کاروں میں بہت زیادہ مقبول ہیں جسٹس میں پیدا ہوئے، بل یونیورسٹی امریکہ سے سند حاصل کی، اولائن صحافت میں آئے پھر فنانس نگاری کا سلسلہ شروع کیا، اور اس وقت ان کے چند افسانے خاص شہرت رکھتے ہیں اور علم کیمیا کا نوبل پرائز پروفیسر ہائز فشر کو عطا کیا گیا، یہ میونخ یونیورسٹی جرمنی میں علم کیمیا کے استاد ہیں۔

## شام میں ایک اہم اثری اکتشاف

موسیو غیرولیو سکریری محکمہ آثار قدیمہ شام نے پیرس کے ایک آثار قدیمہ کی اکاڈمی میں شام کے آثار قدیمہ کے متعلق ایک بیان دیا ہے جس میں ایک اہم سہاری خط کے کتبہ کا تذکرہ کیا ہے یہ کتبہ لاطینی ہے، لکھو میڈ پر ایک پہاڑی چڑھتیاں ہوا ہے اس کتبہ سے ایسے حروف ابجد (حروف تہجی) کا اکتشاف ہوا ہے جو تیرہ سو سال قبل مسیح متعلق تھے، یہ حروف ابجد فنیقی ہیں اور ۲۸ حروف پر مشتمل ہیں بعض اس عہد کے آرامی تمدن سے خاص لگاؤ ہے یہ حروف اینٹ کی سلون پر کندہ ہیں اس میں کل آٹھ سطریں ہیں جو مسلسل ایک رزمیہ قصیدہ پر مشتمل ہیں، جس میں فنیقیوں کے قدیم افسانے بیان کئے گئے ہیں اس کتبہ کے اکتشاف سے سامی مذہب اور سامی زبانوں کے اصول پر نہایت اہم روشنی پڑتی ہے، اور پھر علماء فن کے درمیان حروف ہجاء کی اصل کے متعلق جو اختلافات ہیں، ان میں بھی جدید کتبہ سے بڑی مدد ملے گی۔

## اندھوں کا ایک ماہوار رسالہ

انگلستان سے اندھوں کے لئے ایک ہفتہ وار اخبار "بنتس" جاری ہے جو مصور شائع ہوتا ہے

اب اسی دفتر سے انجی حروف میں ایک ماہوار رسالہ اعلیٰ پیمانہ پر نکلے والا ہے، یہ رسالہ دنیا میں سب سے پہلا رسالہ ہے جو اندھوں کے پڑھنے کے لئے جاری ہوگا۔

## سیارہ نیچون کا طول یوم

ابھی تک سیارگان فلک میں سے نیچون اور زہرہ کے دنوں کا طول یوم دریافت نہ ہو سکا تھا لیکن ڈاکٹر مورسن اب سیارہ نیچون کا طول یوم مقرر کر دیا ہے ان کی تحقیق میں وہ ۶۰ گھنٹہ کا ہوتا ہے، اب صرف زہرہ اور پلٹیو کے طول یوم کی دریافت باقی رہ گئی ہے۔

## اوبھرنے والے اور ڈوبنے والے جزیرے

بحر ہند میں بعض ایسے جزیرے ہیں جو کبھی ڈوب جاتے ہیں اور کبھی اوبھرتے ہیں، چنانچہ ۱۹۲۲ء میں ہانگ کانگ اور ملائیا کے درمیان ایک چھوٹا سا جزیرہ تھا جس میں کچھ ڈاکو سکونت پذیر تھے، کچھ دن گذرے کہ یہ جزیرہ اچانک آپسے آب ہو گیا، اور جتنے ڈاکو یہاں موجود تھے سب غرقاب ہو گئے، تحقیق کے بعد پتہ چلا کہ اس وقت یہ جزیرہ تقریباً ۲ قد آدم، پانی کے نیچے ہے۔

## ثقل سماعت اور بد مضمی

حال میں شکاگو (امریکہ) کی ایک طبی کانفرنس میں اس عجیب و غریب نظریہ کا اعلان ہوا ہے کہ بد مضمی بھی ثقل سماعت کا سبب ہو سکتی ہے، نیویارک کے ڈاکٹر گوٹ لیب (DR. GOTTLIEB) کا خیال ہے کہ ثقل سماعت کے مریضوں میں سے اکثر دن کو مودہ اور آنتوں کی شکایتیں ہوتی ہیں، ایسے لوگوں کو خصوصاً ڈاکار اور سوزش قلب سے تکلیف رہتی ہے، کھانے کے بعد دیر تک مودہ میں گرانی



کلام شریف

کلام شریف

ارشاد ابوالشرف صاحب مجددی دہلوی ہماجر مدینہ منورہ،

نکلا تھا منہ سے سوزِ جگر کی لپک گئی  
اتھا وہ دردِ دل میں کہ بجلی چمک گئی  
یہ بھی شگوفہ ایک بہارِ خزان کا تھا  
گلشن میں چھپاتے ہی بلبل بھڑک گئی  
نکلی کوئی امید نہ نکلے مکان سے وہ  
حسرت غریب در پہ سرِ ناپائیک گئی  
کچھ بھی نہ آنسوؤں سے بھیجے دل کی گت  
چھینٹا پڑا تو اور بھی ظالم بھڑک گئی  
لو اشکِ عندلیب کے موتی بکھر گئے  
موجِ نسیم دامنِ گل کو جھٹک گئی  
لبائے کچھ تو منزلِ مقصود کا پتہ  
اے یاس کر مدد مری امید خاک گئی  
باتیں کسی کی بزمِ گلشن بن گئیں  
منہ سے جھڑے وہ بھول کہ محفلِ ملک  
تہا وہ جائیں ہو نہ سکا چشمِ ودل سے  
حسرت کے ساتھ میری نظرِ دور تک گئی  
جھونکا نسیم صبح کا بادِ فنا ہوا  
دامنِ بینِ تمی خزان کے کلی جھٹک گئی  
وعدہ بشرطِ یاد کیا تھا جو آنے کا  
بھولے سے آج یاد بھی رستہ بہک گئی

ہے مست اسی کی نکست مسانہ کاشف

جس بھول کی شمیم سے دنیا دمک گئی

رہتی ہے اور اکثر قبض رہتا ہو، ساتھ ساتھ در دوسرے شعبہ بھر اور اضمحلال کی شکایت بھی ہوتی ہو عام طور سے یہی شکایتیں نقلِ سماعت کے پیدا ہونے سے قبل پائی جاتی ہیں، ڈاکٹر موصوف نے نقلِ سماعت کے اکتالیس مریضوں کا مندرجہ تفصیل کے ساتھ طبی معائنہ کیا جس سے معلوم ہوا کہ ان میں سے اکتالیس کو بدہنسی کی شکایتیں تھیں۔

## چھرون کی غذا

چھرون کی بسر ہمیشہ خون ہی پر نہیں ہوتی، وہ کثرت سے ایسے مقامات پر بھی رہتے ہیں جہاں کسی قسم کا خون نہیں ملتا، مثلاً صحرائے افریقہ اور قطب شمالی کے برفانی مقامات، ان کی فطری غذا پودوں کا عرق ہی ہے حال کی تحقیقات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس قسم کے عرق کو خون پر ترجیح دیتے ہیں، بہر حال اس میں شبہ نہیں کہ چھرون مقامات پر بھی اطمینان سے رہ سکتے ہیں جہاں کسی قسم کے جانور نہ پائے جاتے ہوں، نہ چھرون مطلق خون نہیں چوستا، یہی نہیں کہ چھرن کی مادہ تر سے زیادہ خطرناک ہوتی ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ نہ کبھی نہیں کاٹتا

## ہوائی جہاز اور ریلوے ٹرین کی معاوت

یورپ اور آسٹریلیا کے ہوائی جہاز دن میں نہایت تیز سرچ لائٹ (SEARCHLIGHTS) لگائی جا رہی ہیں، جہاں مقصد یہ ہے کہ جہاز دن کے خطرہ کے اوقات میں ان روشنیوں کے ذریعہ سے ریلوے ٹرینوں کو روک کر مسافروں کو منتقل کر دیا جائے، ان میں سے بعض روشنیوں پانچ لاکھ بتی طاقت (500,000 WATT) کی ہیں، جہاز کے رہنا کو جب کوئی دشواری پیش آتی ہے تو وہ اسی روشنی سے اپنا اثر کا اشارہ کرتا ہے اور ٹرین رک جاتی ہے۔

## مریض درختوں کے معالج کیلئے ایک آلہ کی ایجاد

برلن کے مصنفات میں ایک بیغ کے اندر چند ماہرینِ قلم نباتات اپنے اپنے علمی تجربوں میں مشغول ہیں، یہی سلسلہ میں ان ماہرین فن نے ایک جدید آلہ ایجاد کیا ہے، جو درختوں کے عوارض کی اصلاح میں کام آئے گا، یہ آلہ مریض درختوں پر لگایا گیا، اور مقصد میں پوری کامیابی حاصل ہوئی، اس آلہ کا



## لیے ہوئے

از جناب مشہدی صوفی آبادی

ہے آرزو تری دل مضطرب ہوئے      بیتاب ہے جناب سمندر لیے ہوئے  
 آئی بہار شیشہ و ساغر لیے ہوئے      ہر موج گل ہے زلف مجھ لیے ہوئے  
 دیوانگی شوق کا عالم ہے دیدنی      دیوانہ اور شورش محشر لیے ہوئے  
 رندان بادہ نوش بھی جوش بہا ہے      اچھلین کہین نہ ہاتھ میں ساغر لیے ہوئے  
 بھیلی ہوئی ہر بزم تصور میں روشنی      پہلو میں کسکو ہے دل مضطرب لیے ہوئے  
 پھر اس کی چشم مست سے ہر دلوں کا تباہ      پھر جھومتا ہوں شیشہ و ساغر لیے ہوئے  
 ہر ذرہ اضطراب میں ہر قطر شوق سے      یعنی ہوں دل میں فتنہ محشر لیے ہوئے  
 پھر اٹھ رہی ہر قلب میں اک موج انبساط      طوفان صد نشاط ہے ساغر لیے ہوئے  
 ہر قطرہ خون ل کا ہر اک جذبہ رقص میں      وہ آ رہے ہیں ہاتھ میں خنجر لیے ہوئے  
 سرخ آنسوؤں کے داغ محبت کے پھول میں      یعنی ہر اشک اشک گل تر لیے ہوئے  
 کیا تنگائے دہر میں جاتا ہے سیر کو      دنیا ہے آرزو دل مضطرب لیے ہوئے  
 دل میں نمودن سر ہے ارتقاء غم      یعنی خیال یا رہے نشتر لیے ہوئے  
 دل کا سفینہ غرق نہ ہو مشہدی کہین      ہر قطرہ اشک کا ہی سمندر لیے ہوئے

## غزل

از نجم مذوی

ہے نگاہ فریب اثر کب تک      کوئی بھٹکے ادھر ادھر کب تک  
 بحر ہستی میں جب قدم رکھا      موج و طوفان سے پھر کب تک

پیچھے لاکھ جام آب حیات      لکھی مرگ سے مفر کب تک  
 گلہ جو بر آسمان تاکے      شکوہ آہ ہے اثر کب تک  
 رہے منت پذیر ابر کرم      سوزِ دل، سوزِ لب، مگر کب تک  
 رند طامع، تو نازنین ساقی      دیکھئے آئے جام ادھر کب تک  
 تاجکے غم میں خود کشی سے گریز      انتظار اجل، مگر کب تک  
 تاج کے زلف یا رکا سودا      یہ ستائے گادر دسر کب تک  
 عمر بھر کون کس کو رویا ہے      روئیں گے مجھ کو نوہر کب تک  
 کچھ رہائی کی بھی رہیں خوشیاں      ماتم سخت بال و پر کب تک  
 کہین آسن جا کے بیٹھ رہیں      نجم بھرنے کا در بدر کب تک

## کلام پیش

شیخ عبداللطیف صاحب پیش، محکم گورنمنٹ کالج پور

جان دینا مرا ہنسی ہی سہی      دل لگی ہو تو دل لگی ہی سہی  
 کل تو رونا پڑ گیا ہنس لو آج      عشق کی ابتدا ہنسی ہی سہی  
 اپنے وعدے سے آپ نہ پھرتے      میری تقدیر میں بدی ہی سہی  
 لطف ابر بہار تم دیکھو      دیدہ تر، نمائشی ہی سہی  
 آزمائش ہے ظرب و لطف کی      میرے حقے میں کچھ کمی ہی سہی  
 نہ بچاؤ مرا چسپراغ و فنا      رونق بزم مدعی ہی سہی  
 کر چکے آپ دوستی مجھ سے      او کچھ درد و دشمنی ہی سہی  
 اپنی ہستی کی کچھ خبر ہے پیش      نہ سہی بخودی خودی ہی سہی



## بِالْتَقْرِیْطِ وَالْاِیْتِقَانِ اُردو کے نئے رسالے

ہم نے مانج سترہ میں اردو کے جدید اخبار و رسائل کو ناظرین کے سامنے پیش کیا تھا، اب نوماہ کی طویل مدت میں اردو فن صحافت میں نئی پیداوار کا ایک انبار لگ گیا ہے، ہمیں قدیم سنت کے مطابق فوج جنوری کے رسالہ میں اردو صحافت کی نئی پیداوار کو ناظرین سے روشناس کرانا ہے۔

اردو کے جدید رسائل اپنے موضوع اور دائرہ عمل کے لحاظ سے مختلف شعبوں میں تقسیم کیے جاسکتے ہیں، چنانچہ ان میں سے ایک فاضل قنداد مذہبی رسالوں کی ہے، پھر طویل سلسلہ علمی و ادبی رسائل کا ہے، چند پرچہ مخصوص خورتوں اور بچوں کے شائع ہوئے، اور چند ایسے بھی ہیں جو عام علمی و ادبی خدمت کے بجائے کوئی مستقل تخیل اپنے سامنے رکھتے ہیں،

مذہبی رسالے | اردو کے جدید رسائل میں سے یہ چند رسالے البلاغ (لکھنؤ) قیام الدین (لکھنؤ) جامع العلوم (کابنور) تذکرہ (منو اعظم گڑھ) آستانہ (اجیر) اور الصدیق (لاہل پور) ہیں، ان میں سے بعض اگرچہ قائل مذہبی نہیں، لیکن ان کے مضامین کا بیشتر حصہ "مذہبی اور اسلامی" مباحث پر مشتمل ہوتا ہے۔

البلاغ اڈیر جناب مولوی سید محمد افضل صاحب ثاقب ندوی ہراچی حجم ۴ صفحہ ماہوار

لکھائی چھپائی اور گانڈہ قلمت: صدر چھپہ، دفتر البلاغ، نظر آباد، لکھنؤ،

مولوی سید محمد افضل شاہ صاحب ثاقب ندوی اردو فن صحافت کے ایسے متکد ارون میں ہیں

جو اپنے طریقہ پر کچھ نہ کچھ ہمیشہ کرتے رہتے ہیں، موصوف کے زیر ادرات البلاغ نام سے ایک ہفتہ وار پرچہ لکھنؤ سے نکلتا تھا وہ اب ماہانہ رسالہ کی شکل میں تبدیل ہو گیا ہے، البلاغ کا اصل مطلق نظر تبلیغ و اشاعت ہے، لیکن چونکہ ایک ہفتہ وار اخبار سے رسالہ کی شکل میں بدل کر آیا ہے، اسلئے روایات قدیمہ کے پاس سے کچھ نہ کچھ سیاسی مقاصد بھی سامنے ہیں، اور اسوقت اس کا دائرہ بحث "تبلیغ و اشاعت" ملکی معاملات و اسلامی سیاسیات اور ایشیا اور عالم اسلامی کے درمیان رابطہ اتحاد و اتفاق ہے، اسلئے مضامین کا بیشتر حصہ مذہبی و اسلامی مسائل پر ہوتا ہے، نیز دعوت اصلاح اور اخلاق و موعظت کا عنصر بھی شامل ہے، رسالہ میں مصروف شام کے اچھے اخبار و رسائل کے اقتباسات و تراجم خصوصیت سے ہوتے ہیں، آخر میں اخبار عالم کے عنوان سے تین چار صفحوں میں ایسی خبریں ہوتی ہیں جو آئندہ زمانہ کے تاریخی واقعات ہو جائیں گے

قیام الدین اڈیر جناب حسن انصاری حجم ۴ صفحہ کا گانڈہ لکھائی چھپائی متوسط درجہ، قیمت للہ رسالہ ۱۰ روپے۔ اشاعت العلوم فرنگی محل لکھنؤ،

قیام الدین، مولانا عبد الباری صاحب فرنگی محل مرحوم کی یادگار، مجلس اشاعت العلوم کا ماہوار آرگن ہے، رسالہ مختلف قسم کے مذہبی، علمی اور ادبی مضامین پر مشتمل ہوتا ہے، مضامین کے پہلو بہ پہلو نظریں اور غزلیں بھی درج ہوتی ہیں، فرنگی محل کو جو مرکزیت حاصل ہے، اس کے لگاؤ سے کبھی کبھی رسالہ کے قلمی معاونین میں ملک کے مشاہیر کے نام بھی نظر آتے ہیں، لیکن پھر بھی یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ انہی مضامین کے پہلو بہ پہلو مشہور مباحث مضامین ایسے درج ہوتے ہیں، جن سے ایک طرف رسالہ کے سیار کو صدمہ پہنچتا ہے، اور دوسری طرف مضامین میں باہمی توازن قائم نہیں رہتا، رسالہ کو جو خیر انتساب حاصل ہے، ضرورت ہے کہ اس کے نمایاں نشان رسالہ ترتیب پائے، لیکن مضامین کی نوعیت میں جو عام تدریجی ترقی ہے اور لائق مدیر جس جانفشانی سے رسالہ کی ترتیب و تدوین میں مصروف ہیں، اس سے توقع ہے کہ ہم اس کو ایسے سیار پر بہت جلد دیکھ لیں گے جو فرنگی محل کی مرکزیت اور مولانا عبد الباری مرحوم کی ذات گرامی



کے شایانِ شان بن کر اور اسلامی ثقافت کو قائم رکھ کر اسلامی علوم و ادب کا صحیح خدمت گزار ہوگا۔

**جامع العلوم** اڈیٹر محکم مولوی محمد فاروق صاحب بہرائچی حجم ۲۲ صفحہ قیمت سالانہ ۲۰ روپے پندرہم صفا

مدرسہ جامع العلوم و جامع مسجد کابنور۔

ہندوستان کے مشہور شہر دہلی میں کابنور کو یہ شرفِ اولیت حاصل ہے کہ شہر کے ہنگامہ انقلاب کے بعد سے پہلے اسی شہر میں علوم عربیہ کی ترویج کے لئے ایک مدرسہ فیض عام کے نام سے مولانا شاہ فضل الرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تحریک سے قائم ہوا اور جس نے سارے ہندوستان میں ایک مرکزی حیثیت حاصل کر لی، پھر امتدادِ زمانہ سے جب اسکی بنیادیں متزلزل ہوئیں تو اسی کی ایک شاخ جامع العلوم نے اس کے بار کو نبھال لیا، اور تادم میں وہ مدرسہ اپنی اسی شاخ میں مدغم کر دیا گیا، اور اس وقت سے آج تک اس نے علوم عربیہ کی قابلِ قدر خدمت انجام دی اور اسوقت قدیم وضع کے عربی مدرسوں میں امتیازی حیثیت رکھتا ہے زیرِ تبصرہ رسالہ اسی مدرسہ کا ایک تبلیغی رسالہ ہے مضامین تمام مرتبہ ہی ہیں، نیز مدرسہ کے حالات و کوائف بھی درج ہوتے ہیں، لیکن افسوس ہے کہ مضامین میں کوئی خاص ترتیب نہیں، بیان تک کہ فہرست مضامین بھی منسلک نہیں، ضرورت ہے کہ رسالہ کی ترتیب و تدوین پر خاص توجہ کی جائے،

تذکرہ مرتبہ جناب ابوالمآثر اعظمی (مولوی فاضل) دفتر اشاعت دارالمطالعات والتصنیف

مولانا غلام محمد حجم ۲۲ صفحہ ماہانہ لکھائی چھپائی اور کاغذ اوسط درجہ قیمت ۱۰ روپے سالانہ

ہمارے پڑوس مولانا غلام محمد سے یہ جدید رسالہ شائع ہونا شروع ہوا ہے، اسوقت اس کا پہلا پرچہ پیش نظر ہے، مرتبہ اشذرات میں تذکرہ کے ابواب یہ قرار دے ہیں "حقائق قرآن"، "نکات حدیث"، "علم کلام جدید حقیقی تصوف"، "تاریخ و سیر ادبیات اخلاق و معاشرت"، "تفہیم اخبار علمیہ"، اور تراجم، لیکن اس پہلے پرچہ میں تین تاریخی مضامین مختصر اور سرسری ہیں اور نکات حدیث کے ذیل میں

الدین النصیحة پر چند صفحے لکھے گئے ہیں، اور دو تین نظمیں اور غزلیں، دعائے کہ رسالہ اپنے مقام مدین آئندہ کامیاب ثابت ہو۔

**آستانہ** اجیر احمد راجہ صاحب کامل اجیری حجم ۳۳ صفحہ ماہانہ لکھائی چھپائی اور کاغذ اوسط درجہ قیمت ۱۰ روپے

دفتر مجلہ آستانہ اجیر شریف۔

"آستانہ" نام سے ایک ہفتہ وار اخبار اجیر سے شائع ہوتا تھا اب اسی کے بجائے یہ ماہوار رسالہ ہی نام سے جاری ہے، رسالہ کا پہلا پرچہ پیش نظر ہے، ہم اسکو صحیح طور پر "خواجہ غریب نواز نمبر کمرہ سکھتے ہیں"، اکثر مضامین حضرت خواجہ غلامیہ الرحمہ ہی سے متعلق ہیں، غالباً آستانہ کا دائرہ عمل تصوف و صوفیائے کرام کی حد تک محدود ہوا اور یہی خواجہ غریب نواز کے آستانہ کے شایانِ شان ہوگا، ضرورت ہے کہ آستانہ کے صفحوں میں صوفیائے کرام کے حالات و سیر اور اخلاق و موعظت کو جدید قالب میں ایسے رنگ سے پیش کیا جائے کہ اسکو زمانہ قبول کر سکے، اور مسلمانوں کے اصلاح معاشرت و اخلاق میں سودمند ثابت ہو۔

**الصدیق** اڈیٹر مولوی احمد دین خان صاحب، وائزیری اڈیٹر جناب شیخ غلام رسول صاحب گجراتی۔

مقام اشاعت: ۵۵ گ ڈاکخانہ کلیانوالہ ضلع لائل پور پنجاب حجم ۲۲ صفحہ لکھائی چھپائی ناقص چند سالہ پیر نفوذ مفت۔

یہ ایک مذہبی تبلیغی رسالہ ہے، اور اسی نوع کے مضامین اور نظموں درج ہوتی ہیں، سرورق پر یہ عبارت سرتا ہے، "مسلمانوں کو دینداری کی صحیح تعلیم دینے والا ادبی علمی اخلاقی مذہبی تاریخی ماہوار تصنیفی رسالہ بعض بعض پرچوں میں سیاسیات ہند پر بھی مضامین ہوتے ہیں جنہیں مسلمانوں کو ال انڈیا کانگریس کے مقاطعہ کی مذہبی حیثیت سے دعوت دی جاتی ہے،

علمی ادبی رسالے | اس دور میں اردو کے علمی و ادبی رسائل بھی بہ کثرت شائع ہوئے، جنہیں سے ہمیں خصوصیت کے ساتھ چند رسالوں کو ادب لکھنؤ، تسمیہ اگرہ، طور دہلی، ارشد دہلی، صدیقی پٹنہ، بہار الدین اور کوثر دہلی کا تذکرہ



کتاب ہے کہ یہی بھی ملک بہ پابندی شائع ہوئے ہیں

ادب - مرتبہ جناب سید اعظم حسین صاحب جم ۲، صفحہ ماہوار لکھائی چھپائی اور کاغذ عمدہ قیمت ساٹھ  
نمونہ کا پرچہ ۲ روپے ۲۰ پتہ دفتر ادب لکھنؤ

ہم رسالہ ادب کا اعلیٰ تذکرہ گذشتہ تبصرہ میں سرسری طور پر پیش کر چکے ہیں اس اثنا میں مقصد و پرچہ  
نظر سے گذرے اور ہم مسرت سے اس کا اظہار کرتے ہیں کہ ہمارے معاصرین میں ایک اچھے ہمسفر کا اضافہ ہوا  
یہ صحیح معنوں میں ایک علمی و ادبی رسالہ ہے، ملک کے اچھے اہل قلم اس کے قلمی معاونین میں ہیں تحقیقی تنقیدی  
تاریخی اور ادبی مضامین بالعموم شائع ہوتے ہیں خصوصاً ادبی نقد و تبصرہ اس کا خاص موضوع ہے اور نہایت حزم و  
معیار سے قلم اٹھایا جاتا ہے اگرچہ یہ بھی صحیح ہے کہ ذاتیات کی جھلک اس حزم و احتیاط پر بھی کبھی نظر آجاتی ہے، اصفہر کی کتاب  
پر تنقید و جواب تنقید کا جو سلسلہ رہا وہ اس سے خالی نہیں ہے اگرچہ عام ادبی رسائل میں یہ طرز تنقید بھی مفقود  
ہے، لیکن ادب کو ہم اس سے زیادہ بلند معیار پر دیکھنا چاہتے ہیں اعلیٰ حصہ مضامین پر بھی ابھی مزید توجہ کی ضرورت ہے  
مسلک و جذبہ پر جو مضمون شائع ہوا ہے اس کے مباحث و مواد شائع شدہ ترتیب کے بجائے دوسری ترتیب کے  
محتاج ہیں اسی طرح کبھی کبھی اجنبی مضامین کے مباحث میں تشنگی باقی رہ جاتی ہے، اسی طرح رسالہ کا سرورق آٹھ  
ہی حکیم و دید کے تجربوں کا تعارف بھی مذاق سلیم پر بار ہے، لیکن ان خود وہ گریون سے قطع نظر کر کے بے شبہ رسالہ  
کا ہر پچھلا پرچہ پچھلے سے زیادہ بہتر ہوتا ہے، اور اگر یہی رفتار قائم رہی تو ہمیں پوری توقع ہے کہ ہم بہت جلد اس کو  
اسی معیار پر دیکھ لیں جو حقیقی معیار ادب ہے، ادب بہ شبہ اس وقت بھی وہ ملک کے ادبی رسالوں میں اپنی ایک  
مخصوص جگہ رکھتا ہے، اور گہوارہ علم و ادب لکھنؤ کے اقتساب کے شایان شان ہے،

تسلیم، اگر وہ ادب جناب فانی ہارونی، معاون جناب مانی ہائیں و محمود اکبر آبادی جم ۲، صفحہ ماہوار کاغذ  
لکھائی چھپائی عمدہ قیمت صدر تہہ ۲ روپے ۲۰ تسلیم محلہ مالی تھان - اگر وہ

رسالہ کو دنیا سے ادب کی جس ذات گرامی سے شرف اقتساب حاصل ہوا وہ اس کی کامیابی اور اس کے صحیح معیار  
اور صحیح ذوق کی سب سے بڑی ضمانت ہے، اس سہیلے نمبر میں بھی بعض مضامین تو اور خیالات وغیرہ اچھے بلند  
معیار ہیں، لیکن ہمارے نقطہ نظر سے تسلیم کا سب سے اہم افادہ ہی پہلو برہین پابندی سے کلام فانی کی اشاعت  
ہے، اگرچہ فانی کی غیر فانی شاعری کے ساتھ ان کی غیر مستقل مزاجی بھی شہرہ آفاق ہے، اس لیے ابھی ہماری مسرت  
یہی دعا ہے کہ ہمیں کسی آئندہ موقع پر اس کے چند نمبروں پر کچا تبصرہ کرنے کا موقع ملے، آخرین معاون مدیر  
کو مبارکباد دیتے ہوئے ہمیں کسی قدر تامل ہے، کہ پہلے ہی پرچہ میں "فیض و غضب" کے بجائے "غضب و غضب" شائع ہو  
(ص ۷) اور وہ منتخب مضامین پر نظر ثانی کرتے ہوئے اصلاح نہ کر سکیں، بات معمولی ہے، لیکن ایک قابل قدر  
رسالہ میں ہے، اس لیے اس کا تذکرہ بھی ضروری تھا،

طور، ایڈیٹر جناب منظور احمد صاحب بی اسے جم ۲، صفحہ ماہوار کاغذ لکھائی چھپائی عمدہ قیمت  
پتہ دفتر رسالہ طور درگاہ شریف اندرون جامع مسجد دہلی

یہ ایک "مذہبی ادبی اور سیاسی" رسالہ ہے، اردو کے عام ادبی رسالوں سے اس کی سطح بلند ہے، قلمی مضامین  
کا دائرہ اچھا خاصہ ہے، اس وقت تک دو پرچے اس کے نظر سے گذرے امید ہے کہ رفتہ رفتہ اچھی ترقی کرے گا  
رسالہ محنت اور جانفشانی سے مرتب ہوتا ہے، اردو کے ادبی رسالوں میں مسانت و ثقاہت کی جو عام کمی ہے  
مسرت ہے کہ کارکنان طور نے خصوصیت سے اس کا لحاظ رکھا ہے، اگر اس کی رفتار یہی رہی تو ہم بہت جلد اس کو کسی  
بلند معیار پر دیکھ سکیں گے،

ارمغان - ایڈیٹر جناب شرف مسعودی جم ۲، صفحہ لکھائی چھپائی اور کاغذ متوسط درجہ قیمت پیر  
تہہ ۲ روپے ۲۰ دفتر ارمغان دہلی

یہ ایک ماہوار رسالہ "مصور ادبی رسالہ" ہے، مضامین میں زیادہ تر افسانے یا "افسانہ نما" مضامین  
ہیں، نیز اردو شعر و شاعری بھی اس کا خاص موضوع ہے، رسالہ اپنے ارزان قیمت کے لحاظ سے بیش قیمت ہے



امید ہے کہ ادبی مضامین کے شائق اس کی ہمت افزائی کریں گے۔

صوفی، مدیر جناب محمد الدین صاحب اعوان جم ۵۴ صفحہ لکھائی چھپائی اور کاغذ متوسط درجہ، سرورق

خوشنما، قیمت سالانہ قسم اول سے قسم دوم عام پتہ بہ پتہ می بہار الدین گجرات (پنجاب)

رسالہ صوفی عرصہ دراز سے جاری ہے اب اس نے ایک نیا قالب بدل لیا ہے اور بامعاوضہ مضامین

کے اہتمام سے اچھے خاصے مضامین اسکو حاصل ہو جاتے ہیں، رسالہ کے مضامین زیادہ تر تاریخی و ادبی ہوتے

ہیں، ادب میں بیشتر حصہ افسانہ نگاری ہے کہ اس جدید نظم پہلے سے زیادہ بلند معیار پر شائع ہوگا،

کوثر، ادب جناب پروفیسر ظفر صاحب تابان جم ۱۶ صفحہ لکھائی چھپائی اچھی کاغذ معمولی، قیمت پندرہ

پتہ بہ دفتر رسالہ کوثر دربارہ کلان دہلی،

یہ ایک مذہبی ادبی مصور رسالہ ہے، مضامین میں بھی یہ دونوں عنصر یکجا ہیں، پروفیسر ظفر تابان

عام ادبی رسالوں میں برابر لکھتے رہتے ہیں، توقع ہے کہ رسالہ انکی ادارت میں کامیاب ہوگا،

مدارس کے طلبہ اور کمسن بچوں کے رسالے | اس شمار میں انگریزی مدارس کے طلبہ اور کمسن بچوں کے چند رسالے خزانہ

تاریخ (حیدرآباد) صحیفہ عثمانی (کھام گاؤں) مسلم یونیورسٹی اسکول میگزین (علی گڑھ) عزیز (گورکھپور) اور

جوتنار (لاہور) شائع ہوتے ہیں،

خزانہ تاریخ، (حیدرآباد) مدیر جناب سید یوسف الدین معلم کلیہ جامعہ عثمانیہ، جم ۱۴۷

صفحہ لکھائی چھپائی کاغذ متوسط درجہ ہر ورق خوشنما، قیمت پندرہ پتہ بہ دفتر بزم تاریخ کلیہ جامعہ

عثمانیہ حیدرآباد دکن،

یہ کلیہ جامعہ عثمانیہ کے طلبہ کی بزم تاریخ کا ایک غیر موقت اشتیاع رسالہ ہے، اس بزم تاریخ میں،

تاریخ کے مختلف موضوع پر خطبات کا اہتمام کیا جاتا ہے، اور حیدرآباد اور مختلف اطراف ملک کے ممتاز افاضی

خطبات کے لیے مدعو ہوتے ہیں، انہی خطبات کو مجلس کا بیہ بزم ترتیب دیکر شائع کرتی ہے، چنانچہ اس کا

پہلا رسالہ شرافت میں شائع ہوا تھا، اور اب شرافت کا دوسرا نمبر شائع ہوا ہے جو اس وقت پیش نظر ہے،

اس میں سات آٹھ مضامین "اسلامی حلقوں سے پیشتر ہند کی عام حالت" "خوارج" "نواب

مرشد قلی خان کے کارنامے"، "ملک عینہ"، "امام ابن خزم" "اہم تاریخی نوشتے" اور تاریخ مبنی کے فوائد"

وغیرہ ہیں، پھر اسی طرح چند تاریخی نظمیں "احیاء علوم" "ہادیون کا استقلال اور منہ النساء وغیرہ ہیں" آخر میں بزم کے

حالات و کوائف درج ہیں، رسالہ دلچسپ اور خصوصاً تاریخ کے طلبہ کے لیے سودمند ہے،

صحیفہ عثمانی، (کھام گاؤں) نگران ادارہ تحریر خطیب سید شہیر حسین صاحب، ادارہ تحریر جناب محمد

ایوب صابر سید افسر محمد محمد الدین خان، مرزا غلام دستگیر بیگ صاحبان، لکھائی چھپائی اور کاغذ متوسط

درجہ، قیمت درج نہیں، پتہ بہ دفتر صحیفہ عثمانی، انجمن ہائی اسکول کھام گاؤں (برار)

یہ انجمن ہائی اسکول کھام گاؤں کے شعبہ بزم ادب کا ایک ماہوار علمی و ادبی رسالہ ہے، رسالہ کی طباعت

لاہور میں ہوتی ہے اور اشاعت کھام گاؤں سے، ہمارے پیش نظر اس وقت دوسرا نمبر ہے، جو دوسرے

سے چوتھے نمبر تک تین مہینوں پر مشتمل ہے، اور اس کا مجموعی حجم ۶۰ صفحہ ہے، رسالہ کے قلمی معاونین میں،

مشاق اہل قلم اور فوٹو شق طلبہ دونوں ہیں، مضامین کا عام معیار بلند ہے، اگرچہ مضامین میں زیادہ حصہ تراجم

کا ہے، لیکن انتخاب اچھا ہے، زیر تبصرہ پرچہ میں "یادِ رنگان" (جس میں صوبہ متوسط کے اخبار و رسالوں کی تاریخ

ہے) "خواجہ محمود گادوان شہید" اور "شایان اسلام بہ حیثیت ادیب" وغیرہ مضامین دلچسپ معلومات سے پر

اور معیار کے بلند ہیں، لیکن رسالہ کا خاص نقص یہ ہے کہ اکثر مضامین نامی ہیں مذکورہ بالا مضامین کے نام

ہونے کے علاوہ جو چند افسانے ہیں، وہ بھی مکمل نہیں، "ادبیات" کے عنوان میں انگریزی نظموں کا ترجمہ زیادہ

اور اکثر کی زبان صاف سلیس اور طرز ادا دلکش ہے، اور بعض نظموں کی اصل بھی انگریزی ناپ میں چھاپی گئی ہے،

مسلم یونیورسٹی اسکول میگزین، (مصور) مدیر جناب سید محمد صاحب جم حصہ اردو ۵۰ صفحہ حصہ

انگریزی ۱۰ صفحہ لکھائی چھپائی اور کاغذ عمدہ، قیمت درج نہیں، پتہ بہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ،



یہ مسلم یونیورسٹی کے اسکول کے طلبہ کا میگزین ہے، اس وقت اس کا دوسرا نمبر پیش نظر ہے، مضامین تقریباً سب اسکول کے طلبہ کے ہیں، اور بے شبہ سب کے سب اچھے اور طلبہ کے لیے مفید ہیں، جس میں چھوٹے چھوٹے اخلاقی افسانے، معاشرتی اصلاحی حقائق، جدید تعلیمی مضامین اور چند مضامین شعرو شاعری سے متعلق ہیں، رسالہ مصور شائع ہوتا ہے، اور تصویریں مضامین سے متعلق ہوتی ہیں، زیر تبصرہ رسالہ میں تصویروں کے گیارہ درج ہیں، جو اچھے کاغذ پر صاف ستھری چھپی ہیں، امید ہے کہ یہ رسالہ ملک کے عام اسلامی مدارس میں بھی قبول ہوگا،

عزیز (لاہور) ایڈیٹر جناب بدیع الزمان صاحب اعظمی حجم ۲۴ صفحے سالانہ قیمت پیر، لکھائی چھپائی

اور کاغذ معمولی، پتہ دفتر عزیز جارج اسلامیہ ہائی اسکول گورکھ پور،

گورکھ پور کے چند رؤسا و معززین کی سرپرستی میں کمسن بچوں اور بچیوں کے لیے یہ رسالہ جارج اسلامیہ ہائی اسکول سے نکلنا شروع ہوا ہے، مضامین تعلیمی اور اخلاقی ہوتے ہیں، جو اسکول کے چھوٹے اور بڑے درجہ کے طلبہ کے کام آئیں، مضامین کا بیشتر حصہ جناب بدیع الزمان صاحب اعظمی ٹیچر جارج اسلامیہ ہائی اسکول کے قلم سے ہوتا ہے، نیز اسلامی مدارس کے طلبہ میں مضمون نگاری کا ذوق پیدا کرنا بھی اس کا مصلح مقصد ہے، اور چند مضمون میں نوشق طلبہ کے مضامین درج ہوتے ہیں، ضرورت ہے کہ اسکول کے مسلمان طلبہ اس رسالہ کے خریدار بنیں اور اپنے مضمون نویسی کی مشق پیدا کریں،

ہونہار (ہفتہ وار رسالہ) مرتبہ جناب اکرم صاحب بی لے حجم ۱۶ صفحے فی اشاعت، کاغذ اور لکھائی

چھپائی نہایت اعلیٰ قیمت صر سالانہ، پتہ دفتر رسالہ ہونہار ریلوے روڈ لاہور،

یہ کمسن بچوں کے لیے ایک مفید دلکش اور خوبصورت ہفتہ وار علمی رسالہ ہے، اس کے چند پرچے نظر سے

گذرے اور اس وقت اردو ستمبر ۱۹۳۳ء کا پرچہ سامنے ہے، مضامین میں بچہ کی تعلیمی و علمی ضروریات کا لحاظ رکھا جاتا ہے اور ان کے معیار کے مطابق ہر قسم کا مواد فراہم کیا جاتا ہے، بعض مضامین خاص علمی ہوتے ہیں، جنہیں

بچوں کو مفید معلومات و دلکش انداز میں سمجھائے جاتے ہیں، بعض مضامین تاریخی ہوتے ہیں، اور ان کا انداز بیان بھی دلچسپ اور سبق آموز ہوتا ہے، پھر خصوصیت سے کوئی نہ کوئی اخلاقی نکتہ کہانی کے طرز بیان میں ہر اشاعت میں دیا جاتا ہے، اور اخیر میں ایک صفحہ خبروں کا ہے جس میں بچوں کی استعداد کے مطابق خبریں درج کی جاتی ہیں، اس وقت ملک میں بچوں کے جس قدر رسالے نکل رہے ہیں، ان میں اپنی ترتیب، تنوع مضامین، مباحث کی افادیت، افزائش معلومات، لکھائی چھپائی اور کاغذ کے معیار سے ایک اچھے رسالہ کا اضافہ ہوا ہے، رسالہ کی زبان اور اس کی سلاست اور وافی بچوں کے لائق ہے، امید ہے کہ ملک میں یہ قبولیت کی نگاہ سے دیکھا جائیگا،

عورتوں کے رسالے | اس طرف عورتوں کے رسائل میں سے صرف ایک نیا رسالہ سرتاج ہے جس کو صرف اس لحاظ سے نیا کہتے ہیں کہ اب وہ ملتان سے لاہور چلا آیا ہے،

سرتاج (لاہور) زیر سرپرستی بیگم سر محمد شفیع صاحبہ زیر ادارت سیدہ امتیاز فاطمہ بیگم علویہ رضویہ

دارالاشاعت سرتاج لاہور، حجم ۸۰ صفحے چندہ سالانہ پانچ روپے،

سرتاج سب سے پہلے ۱۹۲۵ء میں ملتان سے نکلا اور ۱۹۲۷ء میں مطبع کی دقتوں کی وجہ سے بند ہو گیا،

اس کے بعد اس کا دوبارہ اجراء ہوا، اور دوبارہ التوا، اب اس کا دفتر ملتان سے لاہور میں منتقل ہو کر آیا ہے، اور سر محمد شفیع صاحبہ کی بیگم صاحبہ نے اس کی سرپرستی قبول فرمائی ہے، اور اس طرح اس کی مستقل زندگی کا سہارا مل گیا ہے، اس طرف سرتاج کے چند نمبر نظر سے گذرے، محترمہ سیدہ امتیاز فاطمہ بیگم طبقہ نوان کے مفید خدمات انجام دینے والی خاتون ہیں اور مسرت ہے کہ موصوفہ کا اپنے خدمات کی انجام دہی میں جو مصلح نظر ہے، وہ جادہ

اعتدال پر قائم ہے، موصوفہ کے پیش نظر مسلمان لڑکیوں میں جدید تعلیم کے ساتھ ساتھ اسلام کی اصل تعلیم و تربیت کی حقیقی روح پیدا کرنا ہے، کہ مسلمان لڑکیاں جہاں جدید تعلیم حاصل کریں اسی کے ساتھ اسلام کی مکمل مذہبی تعلیم سے ان میں جلا پیدا کی جائے کہ وہ اسلامی اخلاق و تربیت کا صحیح آئینہ ہوں، موصوفہ نے ان مقاصد کی تکمیل کیلئے



ایک مدرسہ کی بنیاد ڈالی ہے، اور انہی خیالات کی اشاعت کے لیے زیر تبصرہ رسالہ سرتاج کو جاری کیا ہے، چنانچہ موصوفہ کا یہی مطبع نظر سرتاج کے ہر مقالہ میں جھلکتا ہے، مضامین کا معیار بلند ہے، جو اپنے موضوع کے لحاظ سے مختلف نوع کے ہوتے ہیں، ادبیات کا منہ بھی ہوتا ہے، جسمیں شریف ہونیوین اور کنواری لڑکیوں کے پڑھنے کے لائق تعلیم اور غریبین ہوتی ہیں، رسالہ عمومی حیثیت سے مفید اور دلچسپ ہے، امید ہے کہ وہ نسوانی طبقہ میں قبولیت کی نگاہ سے دیکھا جائیگا،

کسی ایک موضوع کے ترجمان | اسی زمانہ مدت میں چند ایسے رسالے بھی نکلے ہیں جو خصوصیت کے ساتھ کسی ایک موضوع سے متعلق ہیں، وہ ضیاء القریش (امرتسر)، فلم ریویو (کلکتہ) اور

الکشاف حیدر آباد میں،

ضیاء القریش، ایڈیٹر فاضل غایت علی صاحب جم ۲۵ صفحے، لکھائی چھپائی اوسط درجہ قیمت عام

پتہ: رسالہ ضیاء القریش علاقہ نمبر ۱۰ امرتسر،

ضیاء القریش "انجمن قریشیان ہند" کا خاص آرگن ہے، یہ انجمن "قریشیان ہند" (جنہیں عرب عام میں شیخ کہا جاتا ہے) کی باہمی تنظیم کے لیے عالم وجود میں آئی ہے، کہ وہ ہندوستان کی اس قوم کے حالات درست کرے، دوران کے تعلیمی، تجارتی، صنعتی اور باخصوص معاشرتی حالات کو سدھارے، یہ رسالہ انہی مقاصد کی تبلیغ و اشاعت کرتا ہے، علاوہ ازیں مختلف مذہبی موضوع پر مختلف مضامین شائع ہوتے ہیں، امید ہے کہ یہ رسالہ اپنے قارئین میں قیام کی نگاہ سے دیکھا جائیگا،

فلم ریویو، ایڈیٹر وائی کے طارق، جم ۲۲ صفحے، لکھائی چھپائی اور کاغذ عمدہ، قیمت سالانہ چار پتہ بہ

دارالاشاعت نمبر ۱۲ و ۱۳ پٹوار پٹکان کلکتہ،

فلم ریویو ہندوستانی فلم سازی کا ترجمان ہے، کلکتہ سے شائع ہوتا ہے، ابتداء میں چند صفحے شذر آ کے ہیں، جنہیں ہندوستان کی "فلمی دنیا" پر راہنیں ہیں، پھر مضامین شروع ہوتے ہیں، جو فلم سازی، فلمی فن

کی تفصیل و تشریح، ڈرامہ کے تاریخی پہلو پر بحث اور فلم ایکٹر اور ایکٹرس کے سوانح حیات اور کارناموں کی تفصیل میں ہیں، اسکے بعد "معلومات" کا عنوان ہے، جس میں فلمی افسانوں کی خبریں درج ہیں، پھر فلم کی خبریں کے عنوان میں "کلمتہ" اور مدراس وغیرہ کی مشہور فلم کمپنیوں کی اہم خبریں درج کی جاتی ہیں، رسالہ میں فلمی مناظر، فلم ایکٹر اور ایکٹرس کی تصویریں آرٹ سپر پر شائع کی جاتی ہیں،

الکشاف (حیدر آباد) مدیر جناب محمد حمید اللہ صاحب ایم اے ال بی، شرکائے مدیر جناب

ضیاء الدین احمد، محمد فاروق اور غلام علی صاحبان جم ۲۲ صفحے تقطیع ۱۸x۲۲ کاغذ لکھائی چھپائی

متوسط درجہ چند سالانہ سے پتہ: بوسے اسکاؤٹ ہیڈ کوارٹرس سیف آباد حیدر آباد،

یہ حیدر آباد دو اسکاؤٹس ہیڈ کوارٹرس ٹروپ کا ماہوار فنی رسالہ ہے، اس کا موضوع بحث اسکاؤٹ

ہے، جس کا حیدر آباد میں "کشاف" ترجمہ کیا گیا ہے، رسالہ کی اہم خصوصیت یہ بتائی گئی ہے کہ اس کے تمام مضامین

معاوضہ ویکو حاصل کئے جاتے ہیں، اس کا دوسرا نمبر پیش نظر ہے، تمام مضامین موضوع سے متعلق ہیں جنہیں

"اسکاؤٹ کے فرائض" اسکاؤٹ کے ابتدائی معلومات، اسکاؤٹ کا نصاب تعلیم، اور "اسکاؤٹ کے نمونے

اسلامی تاریخ میں بتائے گئے ہیں، حیدر آباد کی یہ اسکاؤٹ سوسائٹی ایک مفید کام یہ انجام دینا چاہتی ہے کہ

"مورس" سسٹم کے بجائے عربی حروف مخففات میں، اشاروں کی گفتگو کے طریقے ایجاد کرے۔

اور اس کا ابتدائی کوڈ ترتیب پاچکا ہو، اور اس دوسرے نمبر میں "اردو مورس" کے عنوان سے ایک مختصر

مضمون بھی درج ہے، امید ہے کہ حیدر آباد کے علاوہ دیگر مقامات کے وہ مسلمان طلبہ جو بوسے اسکاؤٹ

کے نظام میں شامل ہیں، اس رسالہ سے فائدہ اٹھائیں گے،

"۱"

لے اس مہینہ میں گنجائش نہ ہونے کی وجہ سے رسالوں کے خاص نمبر اور نئے اخبارات پر تبصرہ شائع نہ ہو سکا  
یہ آئندہ مہینہ میں پیش ہوگا،



## مطبوعات علیہ

سلطان شہید :- از جناب محمود خان صاحب محمود بنگلوری حجم ۱۰۰ صفحے کاغذ عمدہ اور لکھائی

چھپائی متوسط قیمت، اربہ جناب محمود خان صاحب ۹۴ بلا کیلی روڈ کنتونٹ بنگلور،

ٹیپو سلطان کو ہندوستان کی پچھلی تاریخ میں جو نمایاں امتیاز حاصل ہے، حقیقت یہ ہے کہ وہ اس کا مستحق ہے، کہ اس کی ایک مستند تاریخ ہماری زبان میں لکھی جائے، اب تک اس بحث پر جو کچھ ہوا ہے وہ بیک وقت ناقص ہے، اس خاندان کی تاریخ کے لئے ضرورت ہے کہ فارسی، مرہٹی، انگریزی اور فرنگ میں جو کچھ ہے، اسکو پڑھ کر لکھا جائے، شکر ہے کہ سلطان مرحوم کے ایک ہم وطن اہل قلم جناب محمود خان صاحب محمود بنگلوری نے ادھر توجہ کی ہے، انھوں نے سلطان شہید کے نام سے ٹیپو سلطان کے اجمالی حالات زندگی اور اہم کارناموں قلمبند کئے ہیں کتاب گو ایک حد تک دلچسپ ہے، تاہم ادھون کو ہم مکمل نہیں کہہ سکتے مصنف نے اپنی کتاب سلطان شہید کے ساتھ والہانہ عقیدت سے لکھی ہے سلطان کی علمی اور قومی کوششوں کو بھید کر لکھا ہے، اس کی رحمدلی اور بے تعصبی کے واقعات بھی درج کئے ہیں، زبان میں گو غلطیاں پائی جاتی ہیں، مگر ہم ان کو دکھنی اردو سمجھ کر مواخذہ کے قابل نہیں سمجھتے، باہمہ طرز بیان میں سلامت، روانی اور دلکشی ہے،

یوم عزائم :- جناب مولوی سید راحت حسین صاحب بی ایچ بی ال وکیل، صدر

دارالتالیف، پچھڑہ ضلع سارن حجم ۴۴ صفحے تقطیع چھوٹی، لکھائی، چھپائی اور کاغذ عمدہ،

قیمت ۴ روپے :- مرقوب بک اینڈ سنی لاہور،

جناب مولوی سید راحت حسین صاحب بی ال وکیل کو علم ہیئت و ریاضی سے خاص لگاؤ ہے اور وہ اس موضوع پر مختلف رسائل القرد وغیرہ شایع کر چکے ہیں، اب انھوں نے واقعہ کر بلا کی صحیح شمسی تاریخ پر محققانہ نظر ڈالی ہے اور علم ہیئت و ریاضی کے مختلف اصول و قوانین سے مدد لے کر ثابت کیا گیا ہے کہ یوم عاشور شمسی حساب سے ۱۳ اکتوبر یوم چہار شنبہ کو واقع ہوا، یہ حیثیت تو اس رسالہ کی ایک علمی حیثیت تھی، اسی کے ساتھ موصوف نے اس موضوع پر اپنے مذہبی نقطہ نظر سے بھی بحث کی ہے، اور ماتم کنان واقعہ کر بلا کو محرم کی دسویں تاریخ میں مراہم مذہبی ادا کرنے کے علاوہ ہر سال کی ۱۳ اکتوبر کو بھی یوم عزائم ماننے کی دعوت دی ہے اور شیعہ نقطہ نظر سے ان دونوں دنوں یوم عاشور اور یوم عزائم میں چند مخصوص امتیازات بھی قائم کئے ہیں، موصوف کو اپنی اس تحریک میں اتنا انہماک ہوا کہ صرف اسی کی خاطر انھوں نے عراق کا سفر اختیار کیا، اور اپنی تائید میں عراق کے علماء و مجتہدین سے فتوے حاصل کئے، جو رسالہ میں منسلک ہیں، علاوہ ازیں چند صفحوں میں واقعہ کر بلا کا بھی اجمالی ذکر ہے، لیکن اس کے جزئیات تاریخی حیثیت سے استناد کے محتاج ہیں، رسالہ میں قمری سے شمسی تاریخ معلوم کرنے کیلئے مختلف جدولیں بھی دی گئی ہیں،

قدیم افسانے :- مرتبہ جناب عبدالقادر صاحب سروری ام اے ال بی شائع کردہ انجمن امداد باہمی مکتبہ ابراہیمہ اسٹیشن روڈ حیدر آباد کن حجم ۷۷ صفحے، تقطیع چھوٹی کاغذ لکھائی

چھپائی متوسط قیمت، صدر

جناب عبدالقادر صاحب سروری نے "دنیاے افسانہ" کے نام سے ایک مفید سلسلہ افسانہ جاری کیا ہے، اور مسرت ہے کہ اس تقریب میں ان کے قلم سے اردو ادبیات میں ایک دلچسپ اضافہ ہو رہا ہے، اس کے متعدد حصے اب تک شائع ہو چکے ہیں، زیر تبصرہ حصہ میں دنیا کے قدیم افسانے یکجا کیے گئے ہیں، اور قدیم مصری، یونانی، روسی، ہندسی، ایرانی اور عربی ادبیات میں سے مختصر



و دلکش افسانے کہانی کی شکل میں ترتیب دئے گئے ہیں، اور بے شمار سب کے سب پچھلے چین، ہر افسانہ کی ابتدا میں اس کا تعارف اور اس کے متعلق حالات بطور تعلیق درج کئے گئے ہیں، کتاب کی ترتیب خصوصیت کے ساتھ تعریف کے لائق ہے،

**تاریخ الامت** :- (حصہ ہفتم) مصنف مولانا محمد اسلم صاحب حیدر آبادی مج ۱۲۰ صفحے لکھائی چھپائی اور کاغذ متوسط قیمت میں، پتہ بکھتہ جامعہ اسلامیہ قردول باغ دہلی،

مولانا نے تاریخ الامت کے نام سے جو سلسلہ شروع کیا تھا، اس کا یہ ساتواں حصہ تاریخ آل عثمان ہے، اس میں سرسری طور پر ترکوں کی رزمیہ تاریخ نقل کی گئی ہے، کتاب مختصر ہونے کے باوجود دلچسپ ہے، مولانا نے تاریخ الامت کے سلسلہ کو اسی حصہ پر ختم کر دیا ہے، حالانکہ اس سلسلہ کی چند اہم کڑیاں ابھی باقی رہ گئی ہیں، مصنف نے اس آخری حصہ کے دیباچہ میں ان تبصرہوں کا بھی حوالہ دیا ہے جو تاریخ الامت پر وقتاً فوقتاً ہوتے رہے ہیں، اس سلسلہ میں فرمایا ہے کہ یہ کتاب علمی نہیں تعلیمی ہے، اس لئے اس پر زبانِ طعن دراز کرنا سنا نہیں، مولانا خود جانتے ہیں کہ جانتے والوں نے زبانِ طعن کس امر پر دراز کیا ہے، اور جواب کس امر کا وہ دے رہے ہیں،

**مکمل ہندسہ علی**، از جناب محمد میرالدین صاحب بی اسے مددگار ریاضی عثمانیہ سنٹرل ٹیکنیکل

انسٹیٹیوٹ حیدر آباد، مج ۱۰۰ صفحے، تقطیع چھوٹی لکھائی چھپائی معمولی قیمت میں، پتہ بکھتہ جامعہ اسلامیہ سنٹیشن روڈ حیدر آباد،

حیدر آباد کے اسکولوں کے میٹرک کے درجوں میں علم ریاضی پڑھانے کے لئے یہ رسالہ لکھا گیا ہے جو چار حصوں میں منقسم ہے، اور ہر ایک میں میٹرک کی استعداد کے مطابق ریاضی کے مختلف مسائل مشاموں کی ساخت، ذوالربیع الاضلاع، ربیعہ اور دوار کا ذکر ہے اور تمام مسائل کے لئے متقین دی گئی ہیں، رسالہ انصاف کے مروجہ طریقہ پر تالیف ہوا ہے،

## جلد ثبوت ہفتم

ماہ رمضان المبارک ۱۳۲۹ھ مطابق ماہ فروری ۱۹۱۳ء

عدد ۲

## مضامین

شذرات	سید سلیمان ندوی	۸۲-۸۳
مولانا حمید الدین؟	”	۸۵-۸۶
زبان اردو کی اولین تصنیف اور اسکا مصنف	جناب ابن منظور، برفاروقی حیدر آبادی ۹۵-۱۰۰	
خیابان دانش	مولوی ابوالقاسم صاحب تہجد آباد ۱۰۹-۱۱۵	
”خاور نامہ دکھنی“	مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی حیدر آباد ۱۱۶-۱۳۰	
انسان اور معرفت کی نسبت صوفیائے	”ع ز“	۱۳۱-۱۳۹
ایران کا خیال	”د ر“	۱۴۰-۱۴۳
اجبار علیہ	جناب محمد اسد خان صاحب بی اے ملتان ۱۴۳	
سوال بہ اقبال	”ر“	۱۴۵-۱۵۱
اردو کے نئے اخبارات اور رسائل کے	”س“	۱۴۵-۱۵۷
خاص نمبر	”د س“	۱۵۷-۱۶۱
مطبوعات جدیدہ		

## مقالات شبلی

حصہ مذہبی، قیمت پیر

منہج